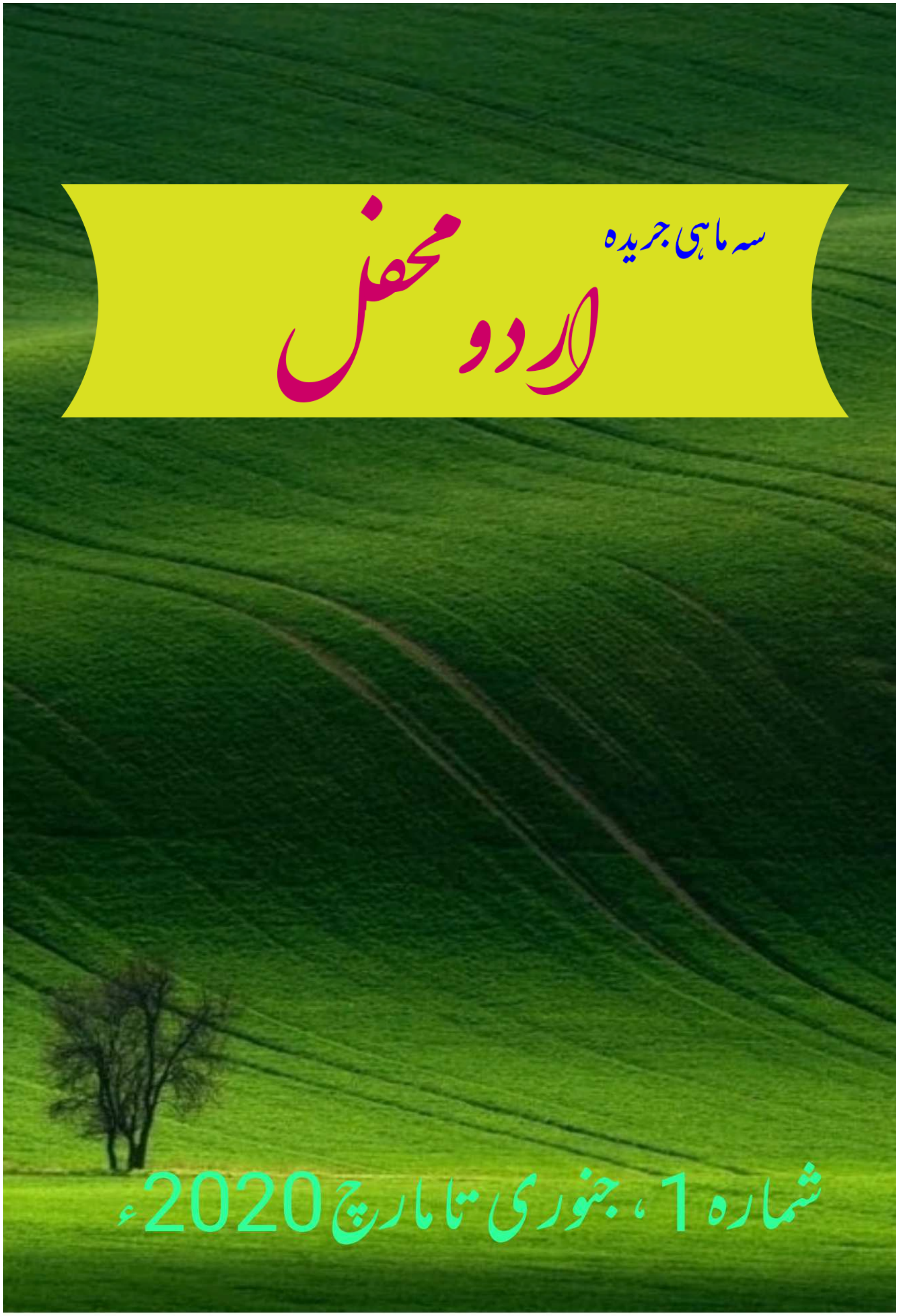

سہ ماہی جریدہ
اردو محفل
شمارہ 1، جنوری تا مارچ 2020ء

سہ ماہی

اردو محفل

شمارہ ۱ [جنوری - مارچ ۲۰۲۰ء]

ادارہ

اعجاز عبید، محمد وارث، محمد خلیل الرحمٰن، محمد تابش صدیقی، ابنِ سعید، محمد احمد

ترتیب

محمد خلیل الرحمٰن

فہرست

اداریہ ۔ ۔ ۔ محمد خلیل الرحمٰن

جون سن دوہزارپانچ میں، یعنی اردو ویب ڈاٹ آرگ کے قیام کے چند ماہ بعد ہی محمد نبیل نقوی (نبیل) ، زکریا اجمل (زیک) اور محمد آصف (آصف) نے ''اردو محفل'' کے نام سے ویب کے پہلے یونی کوڈ اردو فورم کا اجراء کردیا۔ اس ویب فورم کی پہلی سالگرہ پر نبیل نے اپنے پیغام میں (شاید) ایک بار پھر اردو محفل کے اہداف کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں؛

''مجھے نہایت خوشی ہے کہ اردو ویب پر تاریخی اہمیت کے پراجیکٹس پر کام جاری ہے۔ ان میں لائبریری پراجیکٹ، سوفٹویر کی اردو لوکلائزیشن اور اردو لغت پراجیکٹ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کئی سوفٹویر پراجیکٹس پر بھی کام جاری ہے جو اردو کی ترویج میں سنگ میل ثابت ہو سکتے ہیں۔

ابھی ہمارے سامنے کئی منازل جنہیں ہمیں طے کرنا ہے۔ اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں مانی جاتی ہے لیکن بد قسمتی سے انٹر نیٹ پر اس زبان میں مواد نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کچھ عرصہ پہلے تک اردو کا مواد یا تو بی بی سی کی اردو ویب سائٹ پر ہوتا تھا یا پھر اردو بلاگز پر۔ اب غالبا محفل فورم بھی اس میں شامل ہے۔ اردو ویب پر جاری ہونے والا اردو فورم سوفٹویر اردو کی ترویج کی راہ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔

اگرچہ اردو ویب پر تمام پراجیکٹس پر کام آگے بڑھ رہا ہے لیکن میرے نزدیک ایک پہلو ابھی تک تشنہ ہے اور وہ ہے ایک آن لائن جریدے کا اجراء۔ اس کی راہ میں اگرچہ چند تکنیکی رکاوٹیں حائل ہیں۔ بہر حال میں امید کرتا ہوں کہ کبھی اس سلسلے میں بھی کوئی پیشرفت ہوگی۔ ''

آج تقریباً پندرہ سال کی جد و جہد کے بعد، اردو محفل کا پہلا آن لائن جزیدہ آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ پندرہ سال پہلے جو بیج بوئے گئے، ان سے ایک ننھی سی کونپل نے سر اُبھارا ہے۔ اللہ کی مدد شاملِ حال رہی اور محبّانِ اردو کا تعاون مل گیا تو اس کونپل سے پودا بننے کے مراحل بھی طے ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

اس جریدے پر دِل کھول کر اپنی رائے سے نوازیے، اگلے شماروں کے لیے اپنی نگارشات اردو محفل پر پیش فرمائیے اور ہمیں اپنی دُعاؤں میں شامل رکھیے۔

مضامین

رباعی کے حوالے سے کچھ استفسارات اور میرے جوابات ۔ ۔ ۔ محمد وارث

رباعی کے اوزان کے حوالے سے اس خاکسار نے ایک مضمون لکھا تھا ''رباعی کے اوزان پر ایک بحث''، اسی مضمون کے حوالے سے فیس بُک پر ایک دوست نے کچھ استفسارات کیے تھے، وہ اور ان کا جواب لکھ رہا ہوں ۔

استفسار: یہ جو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' رباعی کا وزن ہے ۔ ۔ تو کیا یہ چوبیس اوزان میں سے ایک ہے؟ اور وہ وزن کیا ہے؟

جواب: دراصل قرآن مجید کی چند ایک آیات اور کچھ احادیث ایسی ہیں جو اتفاقاً کسی نہ کسی وزن پر موزوں ہو جاتی ہیں ۔ انہی میں سے حدیث کا یہ کلمہ بھی ہے کہ رباعی کے ایک وزن پر آ جاتا ہے ۔

اس کی تقطیع کچھ یوں ہے

لاحول ولا قوّۃ الا باللہ

لاحولَ - مفعول

ولا قوَوَ - مفاعیل

تَ اِل لا بل - مفاعیلن

لاہ - فاع

یعنی اس کا وزن 'مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع' ہے ۔

بعض لوگ ضرورت شعری کے تحت اللہ کی ہ گرا دیتے ہیں اس صورت میں آخری رکن فاع کی جگہ فع آ جائے گا اور یوں بھی رباعی کا وزن ہی رہے گا لیکن یہاں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے سو بہتر ہے کہ اللہ کا مکمل وزن لیا جائے۔

یہ رباعی کا ایک انتہائی مستعمل وزن ہے، اور اساتذہ عموماً رباعی کے سلسلے میں سب سے پہلے یہی وزن یاد کروایا کرتے تھے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی ایک رباعی جس میں انہوں نے یہ وزن باندھا ہے

کیا پاس تھا قولِ حق کا، اللہ اللہ

تنہا تھے، پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ

میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ

لاحَولَ ولا قُوَّةَ الّا باللہ

استفسار: غالب کی مشہور رباعی جس پر ماہرین عروض نے اعتراض کیا ہے

دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب

اور کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک ''رک'' کا لفظ زیادہ ہے۔۔ اس بارے میں وارث صاحب کی رائے کیا ہے

جواب: غالب کی مذکورہ رباعی کی بھی دلچسپ صورتحال ہے۔

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب

دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں

سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

کہا جاتا ہے کہ رباعی کے اوزان پر گرفت بہت مشکل ہے اور بڑے بڑے شاعر بھی اس کے اوزان کے بارے میں خطا کر جاتے ہیں جیسے کہ غالب سا شاعر بھی کہ اوپر والی رباعی میں دوسرا مصرع رباعی کے وزن سے خارج ہے۔

غالب کے مذکورہ مصرعے پر سب سے پہلے یہ اعتراض علامہ نظم طباطبائی نے اپنی شرح دیوانِ غالب میں کیا تھا اور اس کے بعد سے 'سخن فہموں' اور 'غالب کے طرف داروں' میں اس پر خوب خوب بحث ہوئی ہے۔

میرے لیے حیرت اور مزے کی بات یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مرتب کردہ دیوانِ غالب اور اپنی شہرہ آفاق شرح ' نوائے سروش ' دونوں میں یہ رباعی لکھتے ہوئے ایک ' رُک '' دوسرے مصرعے سے نکال دیا ہے گویا اپنی طرف سے تصحیح کر دی ہے اور اس کی متنازعہ حیثیت پر بالکل بھی بحث نہیں کی ہے حالانکہ مستند یہی ہے کہ غالب نے 'رک رک کر' ہی کہا ہے۔

یہ بات بھی بالکل ٹھیک ہے کہ اگر مذکورہ مصرعے میں سے ایک ' رک ' نکال دیا جائے تو مصرعہ وزن میں آ جاتا ہے۔ لیکن اس پر دو اعتراض ہیں ایک تو یہ کہ اگر مصرعہ اس طرح کر دیا جائے

دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب

تو وزن میں ضرور آئے گا لیکن اس مصرعے کی ساری دلکشی ختم ہو جائے گی بلکہ ' فضول سا ' مصرعہ ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ غالب سے قادر الکلام شاعر کو کیا علم نہیں تھا کہ مصرع بے وزن ہو رہا ہے اور رباعی کے اوزان میں نہیں آ رہا؟

مولانا نجم الدین غنی رامپوری نے علمِ عروض پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ' بحر الفصاحت ' میں بھی یہ اعتراض غالب کے مصرعے پر کیا ہے اور اس کا جواب اس کتاب کے مرتب سید قدرت نقوی نے دیا ہے۔ انہوں نے اس پر ایک علیحدہ سے مضمون بھی لکھا ہے جو کہ افسوس میری نظر سے نہیں گزرا۔

قدرت نقوی صاحب کے بقول لفظ ' بند ' گو فارسی کا لفظ ہے اور وتد ہے یعنی اس کا وزن ' فاع ' ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ غالب نے اس لفظ کا ہندی استعمال کیا ہے اور ' بند ' کی نون کو نون فارسی کی بجائے مخلوط نون سمجھا ہے، اور جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ نون مخلوط کا کوئی وزن نہیں ہوتا جیسا کہ لفظ ' آنکھ ' میں اس نون کا

کوئی وزن نہیں ہے سو نقوی صاحب کے بقول غالب نے اس کو سبب باندھا ہے یعنی ' بند ' کا وزن ' بد ' یا ' فع ' لیا ہے۔

اگر نقوی صاحب کے مفروضے کو مان لیا جائے تو پھر غالب کا مصرع وزن میں آجاتا ہے یعنی

دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب

دل رک رک - مفعولن

کر بدُ - مفعول

گیا ہے غا - مفاعیلن

لب - فع

یعنی اسطرح یہ مصرع ' مفعولن مفعول مفاعیلن فع ' کے وزن پر آکر موزوں ہو جاتا ہے۔

اس خاکسار کی بھی رائے میں یہ غالب کی عروضی غلطی نہیں ہے، یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ غالب کو رباعی کے اوزان کا علم نہ ہو، بلکہ یہ غالب کی اجتہادی غلطی ہے کہ انہوں نے مصرعے کی دلکشی برقرار رکھنے کیلیے ' بند ' کا غلط وزن لے لیا ہے، کیونکہ بہر حال بند میں نون مخلوط نہیں ہے بلکہ یہ لفظ فارسی کا ہے اور اس میں نون فارسی ہے جیسے ' رنگ ' جنگ وغیرہ میں۔

استفسار: اقبال کی دو بیتیاں جنہیں عرف عام میں رباعی بھی کہا جاتا ہے اور غالباً اقبال نے انہیں خود بھی رباعی کہا ہے۔ اور وہ رباعی کے اوزان میں نہیں آتے۔ کیا ان سے قطعات کو رباعی کہنے کا جواز نکلتا ہے؟ مثلاً ''تراشیدم، پرستیدم، شکستم'' والا قطعہ۔

جواب: یہ بات تو طے ہے کہ رباعی اور قطعے میں بنیادی فرق وزن کا ہی ہے، باقی فرق ضمنی سے ہیں۔ جو دو شعر رباعی کے مذکورہ چوبیس اوزان میں ہیں وہ رباعی ہے وگرنہ قطعہ۔

اگر اس فرق کو روا نہ رکھیں تو پھر رباعی بہ حیثیت صنف کے ختم ہی جائے گی لہذا اس خاکسار کی ذاتی رائے میں اقبال نے اپنی دو بیتوں یا قطعات کو جو اپنی کتابوں میں رباعی لکھا ہے تو اس سے قطعے کو رباعی کہنے کا جواز نہیں نکلتا۔

لیکن اس بات سے ایک بڑا اہم سوال یہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ پھر اقبال نے ان دو بیتوں یا قطعات کو رباعی کیوں کہا اور ان کی زندگی میں ہی جو اردو اور فارسی کتب طبع ہوئیں ان کو رباعی ہی لکھا ہے گویا یہ ان کی اجازت سے لکھا گیا ہے حالانکہ وہ رباعی کے اوزان میں نہیں ہے۔ تو پھر کیا وجہ تھی؟ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ وہ رباعی کے اوزان کو نہ جانتے ہوں۔

خاکسار کے محدود علم میں ایسی کوئی کتاب یا مضمون نہیں گزرا جس میں اقبال سے اس بابت میں استفسار کیا گیا ہو کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر علامہ کا جواب مل جاتا تو بات صاف ہو جاتی ہے لیکن اس کی غیر موجودگی ظاہر ہے ہم صرف قیاس ہی کر سکتے ہیں کہ علامہ نے ایسا کیوں کیا۔

میرے نزدیک، رباعی کا چونکہ لغوی مطلب چار مصرعے والی ہے تو ہو سکتا ہے کہ اقبال نے اس وجہ سے ان قطعات کو رباعی لکھ دیا ہو۔

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فارسی کے ایک قدیم اور مشہور شاعر ہیں بابا طاہر عریاں، انہوں نے صرف رباعیات ہی کہی ہیں اور ان کے کلام کو ' دو بیتی ' بھی کہا جاتا ہے اور رباعی بھی حالانکہ وہ رباعی کے مروجہ اوزان میں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اقبال نے ان کے تتبع میں ایسا کیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب

لیکن ایک بات تو طے ہے کہ فارسی کے قدیم شعرا سے لے کر ہمارے عہد کے شعرا تک، جتنے بھی مشہور رباعی گو شعرا ہیں انہوں نے جب بھی رباعی کہی رباعی کے اوزان میں ہی کہی سو رباعی اور قطعہ میں فرق ضروری ہے۔

* * *

قوموں کی سربلندی اس کے کردار میں پنہاں ہے۔۔۔ طارق محمود مرزا

میں جب بھی شہر کی گہما گہمی سے اُکتا تا ہوں تو آسٹریلیا کے کسی دیہی علاقے کا رُخ کرتا ہوں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے قصبات بلکہ گاؤں میں بھی ہوٹل دستیاب ہیں۔ جدید سہولتوں کے باوجود گاؤں کی زندگی اب بھی زیادہ نہیں بدلی بلکہ صدیوں پرانی طرز پر قائم ہے۔ وسیع رقبے پر بنے سادہ سے مکانات، کھلی سڑکیں، درختوں اور سبزے کی بہتات، صاف سُتھری آب و ہوا اور حدِّ نظر تک پھیلے کھیت اور کھلیان فطرت سے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ تنہائی اور سکوت درکار ہو تو فارم ہاؤس بھی کرائے پر مل جاتے ہیں۔ چند ماہ قبل ہمیں ایسے ہی ماحول کی طلب محسوس ہوئی تو ہم نے نیو ساؤتھ ویلز اور کوئنز لینڈ کے درمیان واقع شہر تاری (Taree) کے مضافات میں ایک فارم ہاؤس چند دنوں کے لیے بُک کرا لیا۔ راہ کے خوشگوار مناظر دیکھتے، سبزے اور درختوں کے بیچ ہموار سڑک پر چلتے اور بھیڑوں، گائیوں اور گھوڑوں کے فارمز کا مشاہدہ کرتے پانچ گھنٹے کے بعد ہم اس فارم کی طرف مڑنے والی سڑک کے سامنے جا پہنچے۔ فارم ہاؤس کی طرف جانے والی یہ دو کلو میٹر سڑک کچی تھی مگر اس پر چھوٹے چھوٹے پتھروں کا فرش بچھا ہوا تھا جس پر گاڑی چلنے سے کڑکڑاہٹ کی آواز آتی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف گھنے، اُونچے اور قدیم درخت استادہ تھے جن کی خستہ ڈالیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتی ہیں۔ ہم فارم ہاؤس کے سامنے پہنچے تو دور دور تک جنگلوں میں گھرے، آبادیوں سے دور اس اکلوتے گھر کو دیکھ کر یوں لگا جیسے جنگل میں بہار آ گئی ہے۔ کیونکہ گھر کے چاروں اطراف بڑے درختوں کے بجائے بے شمار چھوٹے اور پھول دار پودے رنگ بکھیر رہے تھے ان میں پھلوں سے لدے لیمن، مالٹے، سٹرابری اور سیب کے درخت بھی شامل تھے مرکزی دروازے کے پاس لگی انگور کی بیل گھر کی دیوار پر پھیلی تھی۔ جب کہ عقب میں کافی دور تک گھاس کا میدان تھا جہاں بکریاں، گائیں اور گھوڑے چر رہے تھے۔ گھر کے اردگرد آہنی تاروں کی باڑ تھی اور سامنے دھکیل کر کھلنے والا گیٹ تھا۔ گیٹ کھول کر ہم گاڑی اندر لے گئے اور ایک شیڈ کے نیچے پارک کر دی۔ گھر کے باہر نمبر کے علاوہ کچھ نہیں

لکھا تھا اس لیےمجھے کچھ شک تھا کہ یہی ہمارا مطلوبہ فارم ہاؤس ہے۔ یہ شک رفع کرنے کے لیے وہاں کوئی فرد موجود نہیں تھا۔ میں نے فارم کی مالکن کو فون کر کے بتایا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس نے فون پر ہی خوش آمدید کہا اور بتایا ''چابی مرکزی دروازے کے سامنے دیوار پر چسپاں ایک بکس کے اندر ہے اور باکس کھولنے کے لیے کوڈ نمبر یہ ہے۔ گھر کے اندر آپ کو ہر شے تیار اور صاف ستھری ملے گی'' ہم اس خاتون کی ہدایت کے مطابق دروازہ کھول کر اندر گئے تو واقعی پورا گھر سجا دھجا اور صاف ستھرا تھا۔ بستر کی چادریں، تکیے، تولیے، فریج، ٹی وی، چولہے، برتن، کیتلی، ٹوسٹر، لائبریری، ویڈیو، برآمدے میں باربی کیو چولہا اور دیگر سب چیزیں موجود اور صاف ستھری تھیں۔ ہم چار دن وہاں رہے اس دوران کوئی شخص وہاں نہیں آیا۔ آخری دن کرایہ بھی وہیں رکھ کر آئے۔ در اصل ہم نے یہ فارم ہاؤس صرف تین دن کے لیے لیا تھا۔ تیسری رات میرا ایک دوست بھی اپنی بیگم کے ساتھ وہاں آ گیا۔ حالانکہ وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا پھر بھی میں نے فون کر کے مالکن کو بتایا ''آپ کو مطلع کرنا تھا کہ ہمارے دو مہمان آئے ہیں۔ دوسرے یہ پوچھنا تھا کہ کیا ہم ایک رات مزید یہاں رُک سکتے ہیں؟'' میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اضافی افراد کا اضافی کرایہ طلب کرے گی۔ کیونکہ گھر میں جتنے زیادہ لوگ ہوتے ہیں اتنا بجلی اور پانی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ مگر اس نے یہ جواب دے کر ہمیں حیران کر دیا ''مہمانوں کا کوئی مسئلہ نہیں، ہاں آپ ایک رات مزید رُک سکتے ہیں کیونکہ کل کوئی اور مہمان نہیں آ رہا۔ اس اضافی رات کا کرایہ دینے کی بھی ضرورت نہیں''

یہ جواب میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ کافی دیر تک یقین نہیں آیا کہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جنہیں لالچ چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ فارم ہاؤس کی مالک خاتون ایک ریستوران میں اور اس کا میاں کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں۔ یہ بات اس نے خود مجھے فون پر بتائی تھی۔ فارم ہاؤس کا خرچ نکال کر انہیں اس سے معمولی آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود انہیں لالچ اور حرص نہیں تھی۔

اس فارم میں درجن بھر گائیں، اتنی ہی بکریاں اور دو گھوڑے تھے۔ فارم کے مکین کی حیثیت سے آپ کو ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ پچیس ایکڑ میں پھیلے اس فارم میں خود ہی چرتے پھرتے ہیں۔ دھوپ اور بارش سے پناہ لینی ہو تو درختوں کے جھنڈ تلے چلے جاتے ہیں۔ فارم میں تین چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں جہاں بارش کا پانی جمع رہتا ہے وہیں سے یہ اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ہاں مہمان اپنے شوق کی خاطر انہیں چارہ ڈالنا چاہیں تو فارم ہاؤس کے عقب میں ایک شیڈ میں گائے، گھوڑے اور بکریوں کے لیے الگ الگ چارہ موجود ہے۔ چارہ لے کر باڑ کے

پاس جائیں تو گھوڑے اور گائیں جمع ہو جاتے ہیں آپ باڑ کے اوپر سے انہیں گھاس ڈال سکتے ہیں ۔ بکریوں کا الگ باڑہ ہے وہاں پرانا سا شیڈ بھی ہے جہاں وہ سردی اور بارش میں پناہ لیتی ہیں ۔ فارم ہاؤس میں بجلی کی سپلائی ہے مگر اس کے ساتھ شمسی توانائی بھی استعمال ہوتی ہے ۔ آسٹریلیا میں شمسی توانائی کا استعمال عام ہے خاص طور پر دیہی علاقوں میں ۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ فارم ہاؤس میں استعمال ہونے والا تمام پانی بارش سے جمع کیا ہوا ہے ۔ گھر سے ملحق دو بڑے بڑے پلاسٹک کے ٹینک ہیں جہاں چھت سے بارش کا پانی جمع ہوتا ہے ۔ یہی پانی نہانے دھونے، کھانے پینے ہر مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ میں سوچتا تھا کہ آسٹریلیا اور پاکستان کے موسموں میں بہت مماثلت ہے بارشیں اور دھوپ دونوں جگہوں کی مشترکہ خصوصیات ہیں ۔ بلکہ پاکستان میں دھوپ زیادہ پڑتی ہے ۔ وہاں ایسے شمسی پلانٹ آسانی سے اور ارزاں داموں لگ سکتے ہیں ۔ علاوہ ازیں بارش کا پانی جمع کر کے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ تیسری بات یہ کہ ہمارے دیہاتوں میں بھی ایسے تالاب بنائے جا سکتے ہیں جیسے اس فارم میں بنے ہیں ۔ جب بارش نہ ہو تو یہ پانی مویشیوں اور فصلوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے ۔ ان میں سے کوئی کام بھی مشکل اور مہنگا نہیں ہے ۔ نہ جانے اس طرف کسی کی توجہ کیوں نہیں ہے ۔

اس علاقے میں شہد کے بہت سے فارم ہیں ۔ علاوہ ازیں سیب، ناشپاتی، سٹرابری، انگور اور دیگر پھلوں کے باغات ہیں ۔ ہم اس علاقے میں ڈرائیونگ کرتے تو کئی گھروں کے آگے شہد اور ان پھلوں کی فروخت کا بورڈ رکھا نظر آتا ۔ ایک جگہ گاڑی روک کر ہم اندر گئے ۔ وہاں برآمدے میں میز پر خالص شہد کی بوتلیں اور پھلوں کی ٹوکریاں رکھی تھیں ۔ ان پر قیمت درج تھی اور ایک طرف کھلا بکس رکھا تھا، جہاں سے بڑا نوٹ ہونے کی صورت میں آپ اپنا چینج بھی لے سکتے ہیں ۔ وہاں نہ کوئی شخص تھا اور نہ کوئی کیمرہ ۔ لیکن مجال ہے کہ کوئی شخص چوری یا بے ایمانی کرے ۔ گاؤں کے یہ لوگ سادہ اور فطری زندگی گزارتے ہیں ۔ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہوتی مگر وہ قناعت کی دولت سے مالامال ہیں ۔ پرانے گھروں، چھوٹی گاڑیوں اور قدرے غربت کے باوجود بڑے شہروں سے دور رہ کر اپنے طرزِ حیات سے خوش ہیں ۔ یہاں آبادی اور ذرائع روزگار دونوں کم ہیں کیونکہ اس علاقے کی سطح مرتفع پر فصلیں نہیں اُگتیں صرف مویشی بانی، باغبانی اور دیگر چھوٹے چھوٹے مشاغل ہیں جن کی محدود آمدنی ہے مگر وہ صبر شکر کے ساتھ اس سے گزارا کر لیتے ہیں ۔ ایسے علاقے میں قیام کی صورت میں ہمیں اشیائے خورد و نوش کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہاں ریستوران کم اور حلال کھانا نایاب ہے ۔ اس لیے ہم زیادہ سے زیادہ اشیائے خورد و نوش اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں ۔ اسی علاقے کے ایک دور دراز گاؤں کی سیر کے دوران ہمیں اشتہا محسوس ہوئی تو وہاں

نظر آنے والے واحد کیفے کے اندر چلے گئے ۔ سہ پہر کے اس وقت وہاں کوئی اور گاہک نہیں تھا ۔ کیفے کی مالکن اُدھیڑ عمر آسٹریلین خاتون سے ہم نے دستیاب کھانوں کے بارے میں دریافت کیا تو ہمارے مطلب کی کوئی حلال شے موجود نہیں تھی ۔ ہمیں مایوس دیکھ کر یہ خاتون بھی پریشان ہوگئی حالانکہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا ۔ میں نے پوچھا ''آپ کے پاس ڈبل روٹی اور انڈے ہیں؟ اس نے فوراً اثبات میں جواب دیا ۔ ہمارے کہنے پر اس نے ڈبل روٹی، انڈے، پنیر، مکھن، ٹماٹر اور پیاز نکالے ۔ ہم سب نے مل جل کر پیاز، ٹماٹر اور انڈوں کا آملیٹ بنایا، ٹوسٹ گرم کیا، مکھن لگایا اور مزے سے تازہ اور گرم کھانا کھایا جو اس علاقے کی نسبت سے غنیمت تھا ۔ خاتون ہمیں خوش اور مطمئن دیکھ کر بہت خوش تھی ۔ ہم نے نماز ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اس مہمان نواز خاتون کو پہلے تو سمجھ نہیں آیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں ۔ ہم نے سمجھایا کہ ہمیں صاف جگہ اور صاف کپڑا درکار ہے ۔ جب سمجھ آیا تو اس نے فوراً جگہ صاف کی، صاف ستھری چادر بچھائی اور خود دروازے سے باہر چلی گئی ۔ نماز کے بعد ہم نے اس مہربان خاتون کا شکریہ ادا کیا تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ شاید یہ اس کی زندگی کا انوکھا تجربہ تھا ۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی اس خاتون نے مسلمانوں کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ سن رکھا تھا آج پہلی مرتبہ سامنا ہوا تو وہ ششدر رہ گئی ۔ ہمارے لیے بھی یہ 'پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے والا معاملہ تھا ۔ یہ دنیا تو ہے ہی حیرت کدہ، یہاں ایسی حیرتیں اکثر ملتی رہتی ہیں ۔ واپسی کے سفر میں، میں سوچ رہا تھا کہ قوموں کی سربلندی کے لیے وسائل کی نہیں حسنِ اخلاق اور مضبوط کردار کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اطمینان و مسرت کے لیے روپے پیسے کی نہیں قناعت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس خطے میں سکون اور اطمینان کی یہی وجوہات ہیں ۔

* * *

ریسٹ اِن پِیس بیوی ۔۔۔ محمد شکیل خورشید

''مجھے جانے دیں خدا حافظ، ٹھیک ہے''

پانچ جنوری 2019 کی شام سی ایم ایچ لاہور کے آئی سی یو میں تاروں، ٹیوبوں، پٹیوں، نالیوں، پائپوں اور بوتلوں میں جکڑی ہوئی، نیم غنودگی یا بیہوشی کے بین بین کسی کیفیت میں یہ اس کے آخری الفاظ تھے جو میری سماعت نے سنے۔ اتنی نحیف آواز کہ سننے کے لیئے کان آکسیجن ماسک کے ساتھ لگانا پڑے۔

اگلے دن علی الصبح وہ چلی گئی چھبیس سال کی رفاقت، اکیس سال کی جانکاہ بیماری اور انچاس سال کی زندگی سے بھرپور زندگی۔ ایک سانس کے بعد اگلی سانس کی عدم دستیابی سے تمام ہوئی۔

1989 کی ایک شام گھر فون کیا تو امی نے پوچھا ''کہیں کوئی چکر وکر تو نہیں چل رہا، تمہارے رشتے کا سوچ رہے ہیں۔'' زمانہ قبل از موبائل و انٹرنیٹ کی بات ہے، ہفتے میں تین چار بار آپریٹر کی مہربانی سے ''لانگ ڈسٹینس'' کال مل جاتی تو غنیمت ہوتی تھی۔ اگلی کال میں پتہ چلا ماموں کے ہاں بات چل رہی ہے۔ اس سے اگلی کال پر ہاں کی خبر اور اس سے اگلی پر منگنی کی۔ ''ہم رسم کر آئے ہیں، اگلے ہفتے عید کے لیئے آ رہے ہو تو وہ بھی آ کر رسم کر لیں گے۔''

1992 میں ویلنٹائن ڈے کے غلغلے سے تعارف ہونے سے کہیں پہلے 14 فروری کو وہ میرے عقد میں آئی اور اسی سال 27 نومبر کو رخصتی ہوئی۔

وہ کیا تھی؟ سیماب صفت؟ الھڑ؟ نٹ کھٹ؟ چلبلی؟ شاید یہ سب کچھ، اور اس سے بہت زیادہ۔ 1997-98 کی سردیوں میں جان لیوا مرض تشخیص ہوا۔ حالت یہ تھی کہ انگلی میں گینگرین کا خطرہ تھا اور تکلیف کی شدت اتنی کہ آنکھ لگتی تو درد سے جاگ جاتی۔ مگر زندہ دلی کا وہ عالم کہ میری بہن عیادت کے لیے گھر آئیں تو وہ اپنی کھنک دار آواز میں کسی بحث میں مگن تھی۔ میری بہن کہنے لگیں ''لو مریض کی آواز تو باہر گلی تک آ رہی ہے۔'' اس زندہ دلی کے سہارے ہی ساری زندگی گذر گئی۔ لوگ حیران بھی ہوتے تھے، غلط فہمی کا شکار بھی ہوتے تھے اور شک بھی

کرتے تھے۔ یہ بہتان بھی لگا کہ ''انیلا کا تو جب دل چاہتا ہے بیمار پڑ جاتی ہے'' شاید یہ بات اتنی غلط نہیں، صرف تھوڑی الٹ تھی۔ بیماری کے باوجود جب وہ اٹھنے کی ٹھان لیتی تو کسی کو پتہ ہی نہ چلتا کہ اس ہنس مکھ، تازہ دم چہرے کے پیچھے کرب، تکلیف اور کمزوری کی کتنی پرتیں دفن ہیں۔

میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ مجھ جیسا سہل پسند، سست الوجود شخص، اگر یہ اپنی بیماری کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتی تو کیسے اس کی افتادِ طبع کا ساتھ دے پاتا۔ اسے خود بھی احساس تھا، کبھی مسکراتی اٹھلاتی ہوئی ترنگ میں آ کر کہتی، خدا نے بھی مجھے باندھ کر آپ کے حوالے کیا ہے کہ پر نہ مار سکوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے زندگی سے ہار نہیں مانی۔ ہاں ایک طرزِ زندگی عام لوگوں سے مختلف اختیار کرنا پڑا، مگر اس نے کبھی بیماری کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اسی لئے بہت قریبی ملنے جلنے والوں کو بھی اس کی گرتی صحت کا درست اندازہ نہیں تھا۔

بیماری کی تشخیص کے بعد ابتداءً صحت سنبھلنے پر ٹھانی کہ جاب کرنی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر حسن عسکری اور پروفیسر قزلباش جیسے اساتذہ کی شاگرد رہی تھی۔ راولپنڈی میں فضائیہ کے کالج میں سوکس کی لیکچرر شپ کے لیئے انٹرویو ہوا۔ پوچھا پڑھانا کیوں چاہتی ہیں، جواب دیا، سوکس اور پاکستان سٹڈیز ہمیشہ بور مضامین سمجھے جاتے ہیں، میں انہیں دلچسپ بنا کر پڑھانا چاہتی ہوں۔ اور پھر اس نے ایسے ہی کیا، چکلالہ میں فضائیہ سکول ہو، اسلام آباد کا پنجاب گروپ آف کالجز کا کیمپس یا لاہور میں فضائیہ کالج آف ایجوکیشن فار ویمن۔ سب جگہ اس کا ماٹو یہی رہا۔ اس کی موت کی خبر سن کر اس کے ایک سٹوڈنٹ برہان نے میسج کیا (ترجمہ) ''- - - - - وہ ایک آئیڈیل استاد تھیں، ایک ماں کا دل اور صوفی کی روح لیے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، درحقیقت جو سبق انہوں نے مجھے سکھائے وہ نہ کتابوں میں مل سکتے ہیں نہ ہی لفظوں میں سمجھائے جا سکتے ہیں''

وہ کوئی فرشتہ نہیں تھی۔ بھرپور انسان تھی، انسانیت کی تمام کجیوں، کوتاہیوں، کمزوریوں کے ساتھ، لڑتی تھی، جھگڑتی تھی، غصہ کرتی تھی، پریشان ہو جاتی تھی، ناراض ہو جاتی تھی، دکھی ہو جاتی تھی۔ لیکن پھر اُٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ کسی ٹیڑھے رشتہ دار سے، دنیا سے، معاشرے سے، اپنی بیماری سے نبرد آزما ہونے کے لیئے۔ 2010 میں کوما میں چلی گئی، میں نے اس کے ڈاکٹر ونگ کمانڈر فواد احمد سے پوچھا، واپس آ پائے گی؟ کہنے لگے فائیٹر ہیں، یقیناً آئیں گی، شاید کچھ دن لگ جائیں۔ اور وہ عظیم فائیٹر دس گھنٹوں میں آنکھیں کھولے شام کو بیٹے کی سکول میں ایوارڈ

تقریب میں شمولیت کے لیئے مجھے ہدایات دے رہی تھی۔ پھر لوگ کیوں نہ سمجھتے کہ وہ اپنی من مرضی سے بیمار ہوتی ہے۔

2006ء میں جگر کا عارضہ تشخیص ہوا۔ پرانی بیماری بدستور لاحق تھی۔ سی ایم ایچ کے آفیسرز وارڈ میں نرس کچھ ٹیسٹ کے لئے خون کا نمونہ لینا چاہ رہی تھی اور وہ حسبِ عادت چٹکلے چھوڑ رہی تھی اور اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ نرس نے سٹپٹا کر پوچھا ''آپ کو پتہ بھی ہے آپ کتنی سیریس بیمار ہیں؟'' اس نے پٹ سے جواب دیا ''ابھی مری تو نہیں نا!''

ڈاکٹرز ہمیں مسلسل قصداً یا غیر ارادی طور پر اس امکان سے آگاہ کرتے رہے۔ غالباً 2008 یا 2009 کی بات ہے، ایک نیئے میڈیکل سپیشلسٹ کے پاس معائنے کے لیئے گئے تو بیماری کا سن کر پوچھا کب تشخیص ہوئی؟ بتایا تقریباً دس گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ بے ساختہ بولے بڑا ٹائم نکال گئی ہیں آپ تو۔ پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگے میرا مطلب ہے بڑی ویل مینیجڈ ہے آپ کی بیماری۔ وقتاً فوقتاً ایسی باتیں سن سن کر اور بار بار اسے موت کے منہ میں جاتے اور پھر واپس آتے دیکھ کر میں اور بچے بیک وقت دو متضاد ذہنی کیفیتوں کا شکار تھے۔ ایک سطح پر ہم ہمہ وقت اس سانحے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہتے تھے جبکہ دوسری طرف یہ امید بھی بندھی رہتی تھی کہ ہسپتال جائے گی، بیماری سے دو دو ہاتھ کرے گی اور ہنستی مسکراتی واپس آ جائے گی۔

اس بار بھی ہم اسی ذہنی کیفیت کا شکار تھے۔ جبکہ بظاہر تکلیف بھی اتنی شدید نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے اسے کہتے سنا کہ ''مجھے جانے دیں خدا حافظ، ٹھیک ہے'' تو بیک وقت میں دونوں ہی کیفیتوں کا شکار تھا۔ یہ فیصلہ ہی نہ کر پایا کہ یہ کتنا سچ اور کتنا وہم ہے۔ کبھی سوچتا ہوں اس فائیٹر کو اگر میں جواب میں کہہ دیتا کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے تو کیا معلوم وہ اس بار میری خاطر ہی رک جاتی۔

چھ جنوری کی اوس میں بھیگی سرد صبح کو آئی سی یو میں ڈیوٹی نرس اپنے پروٹوکول کے حساب سے مجھے سمجھا رہی تھی ''سرمانیٹر پر یہ پلس دل کی دھڑکن ظاہر کرتی ہے۔ یہ لائین سیدھی ہو جائے تو اس کا مطلب ہے اب زندگی کی کوئی رمق نہیں ہے۔ ہم نے تمام پروسیجر کر کے دیکھ لئے ہیں، آئی ایم سوری''

لائین سیدھی ہو جانے کا مطلب یعنی اب زندگی نہیں رہی۔ تو کیا لائین کا ٹیڑھ ہی زندگی ہے؟ اگر سیدھی لائین موت ہے تو کیا ہر دھڑکن کے بعد اگلی دھڑکن تک کی سیدھی لائین بھی اُس لحظہ کی موت ہے؟ کیا ہر دھڑکن کے بعد انسان موت چکھ کر اگلی دھڑکن میں دوبارہ جی اُٹھتا ہے؟

دعاؤں، سسکیوں، تسلیوں، رسموں، دلاسوں اور مہیب سناٹے کے بعد آج میں تصور کرنا چاہوں تو وہی چلبلی، سیماب صفت تصویر ابھرتی ہے جو برزخ میں مجلس سجائے بیٹھی ہوگی اور منکر نکیر پوچھ رہے ہوں گے ''آپ کو پتہ بھی ہے آخر کار آپ مر چکی ہیں؟''

* * *

مات ۔ ۔ ۔ فائصنہ خان

کھل جا سم سم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھل جا سم سم ۔ ۔ ۔ کھل جا سم سم ۔ ۔ ۔ عمر بھر کے اصولوں کی چٹان کے سر کنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ سوچ کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی بازگشت اسقدر قریب سنائی دینے لگی گویا کنپٹیوں کی رگیں پھول کر پھٹ جائیں گی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد مکمل خاموشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گہرا سکوت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا جمود کہ صبر نے بھی مرثیے پڑھ ڈالے کہ یہ ظلم ہے ظلم در ظلم ۔ ۔ ۔ کہ اس مغاک خاک کو مزید اذیت نہ دی جاوے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے لب خاموش ہو چکے ہیں کہ گنجفہ کے چھیانوے پتوں کی چال چلی جا چکی کہ آٹھ رنگوں میں روز و شب یوں رنگا گیا کہ تین میں تقسیم ہوتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ تلخیِ ایام کو گھونٹ گھونٹ پی کر ہر بار یہی گمان رہا کہ مسافت ختم ہونے کو ہے پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی اپنی حسرتوں کے جام تھامے ۔ ۔ ۔ ۔ سبھی مے خوار دائرے میں پاسے پھینکتے گئے ۔ ۔ ۔

میں چھیانوے بار تمہاری ہار جیت میں تقسیم کر دی گئی ۔ ۔ ۔ ہر پتا تم بڑے مان سے پٹختے تھے اور میں اسی مان سے ہوا میں لہراتے ہوئے خود کو زمین کی سختی پر چور چور ہوتا محسوس کرتی رہی کہ وقت آخر جیت میری ہے ۔ ۔ ۔ ۔

بس اب تو جیت میرا مقدر ہوئی تو اب ہوئی لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ آخری حد پر بھی پاسے کے پلٹتے پلٹتے پھر تین میں بٹ گئی ۔ ۔ ۔ ۔

شطرنج کی کھلاڑی ۔ ۔ ۔ ۔ کالے سفید رنگ میں دنیا کھوجنے والی ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی ذات میں بتیس مہروں جیسی میں ''شاہ زادی'' ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے میرا شہ بچانا تھا ۔ ۔ ۔ اس شہ کو سبھی خانوں میں آزاد رکھ کر خود کالے خانوں میں مقید رہی کیونکہ مجھے جذب کرنا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔

سفید رنگ سے سب رنگ پھوٹتے ہیں اور کالے رنگ میں سب جذب ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ عشق سفید ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عشق کالا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہی وعظ دیتے دیتے میرا گلا بیٹھ چکا ہے۔۔ مگر۔۔۔۔ میری ہمت کسی مرد مجاہد کی طرح چند لمحہ قبل تک جوان تھی کہ گنجفہ کے تیسرے شہ کو مات دے کر میں نے اپنا شہ بچا لیا۔۔۔۔ پر۔۔مجھے مات ہوئی۔۔۔۔ کہ عدم کی مٹی سے اپنا نصیب لکھوا بیٹھی۔۔۔ اپنی بساط سے بڑھ کر تمہاری ہوتی گئی۔۔۔۔ اب مجھ پر موت کی اذیت گراں نہ گزرے گی۔۔۔۔ کہ مجھے مات ہوئی۔۔۔۔

آؤ سوختہ جگر۔۔۔۔۔ آؤ مرض عشق کے اسیرو۔۔۔۔ سنو۔۔۔ جاں نثاری کے شدید جذبے میں پوشیدہ ''جبر'' کی دلکشی عین اس وقت بے نقاب ہوئی جب کشتیوں کی راکھ بھی ناجائز بچے کی مانند کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی گئی۔۔۔۔

مجھے رشک آتا تھا پروانے کی قسمت پر کہ کتنی مدت سے وہ اس دن کا منتظر رہتا ہے جب شمع کی لو اُسے جلائے گی۔۔۔۔ عجیب کیفیت سے دو چار۔۔۔۔۔ ایک عجیب طمانیت کے ساتھ اپنے پروں کو جلتا دیکھے گا۔۔۔۔ طواف کرتے کرتے آخر کو جاں نچھاور کر دیگا۔۔۔۔ اور شمع اپنی مدھم ہوتی لو میں سب منظر دھندلا کر اس کی خاک کو بھی بے وقعت کر دے گی کہ جلنا تو پروانے کا فرض تھا۔۔۔ اب اس میں کیسی قبولیت کیسا مان؟۔۔۔

اسطرح تو نہ داستاں گو کا قصہ ختم ہووے ہے نہ ہی شب کی درمیانی پہر کا کسیلا پن۔۔۔۔۔

تم عروج ٹھہرے اور میں زوال۔۔۔۔

میں ''شاہ زادی'' اپنا زوال قبول کرتی ہوں کہ اس کائنات کی کوئی شے تمہیں مطمئن نہ کر سکی سوائے میرے۔۔۔۔ مگر دیکھو مجھے مات ہوئی۔۔۔

میں قبول کرتی ہوں کہ محبت کی بنیاد کی پختگی میں جو جذبوں کا گارا استعمال ہوا وہ میرے لیے تو تھا ہی نہیں مگر محبت کے محل کی عمارت کی پختگی دیکھو اس کو بڑے بڑے طوفاں بھی نہ ہلا سکے۔۔۔۔ مگر مجھے مات ہوئی۔۔۔

لو قبول کیا کہ محبت سے عشق کے کٹھن زینے کو چڑھنے کے لیے مجھے آنکھوں کے بل آنا پڑا۔۔۔۔ اور جب میں نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا تو عشق کی کرن تمہارے دل میں ابھری یعنی لمبی مسافت تک میں تنہا تھی؟۔۔۔۔ تم عروج ہو میرا زوال ہوا کہ۔۔۔۔ مجھے مات ہوئی۔۔۔۔

یہ محبت میری کوکھ سے پھوٹی تھی اس کو اپنی انا کی خاطر کا اناج کھلا کر عشق میں نے بنایا آج تم اس کے سرپرست بننا چاہتے ہو؟۔۔۔۔

جبکہ تمہیں تب تو محبت ہی نہ تھی جب تم بھی اس کی تخلیق کے مراحل میں میرے ساتھ کھڑے تھے۔۔۔ وہ تو محض تمہارا گمان تھا وہ سایہ تھا۔۔۔ میں تو تنہا تھی روتی بلکتی اجڑتی بکھرتی۔۔۔ آج تم فاتح ٹھہرے۔۔۔ اور۔۔۔۔ مجھے مات ہوئی۔۔۔

سنو۔۔۔

تمہیں جیت دے کر میں نے مات قبول کی۔۔۔۔۔ کہ یہ عشق میں تمہیں ''اپنے ہوش و حواس میں سونپتی ہوں کہ تم تنہا اس کے سرپرست ٹھہرے''۔۔۔

جانتے ہو روشنی گدلے پانی سے نہیں چھنتی۔۔۔۔۔ وہ خود گدلی ہو جاتی ہے۔۔۔۔ میں نے گھوڑے کی ڈھائی گھر کی چال چل کر۔۔۔۔ تمہیں گدلا ہونے سے بچا لیا۔۔

***

طنز و مزاح

بچپن کی حماقتیں ۔۔۔ سید عمران

(۱)

اُن دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے دودھ کے دانت جھڑ گئے تھے ۔ تب والدہ کی بہن خالہ ہوتی تھیں ۔ آج کل آنٹی کہلاتی ہیں ۔ ارشد، نعمت خالہ کے پہلوٹے تھے ۔ ہمارے خالہ زاد بھائی تھے ۔ اب بھی ہیں ۔ ان کے علم سے مرعوب ہوکر سب انہیں فلسفی کہتے تھے ۔ فہدان سے چھوٹے تھے ۔ چھوٹے ہونے کی وجہ بتاتے ہیں کہ دیر سے پیدا ہوئے ۔ ایک دن ہم نے ان کے نام کا مطلب پوچھا ۔ تب سے چیتا مشہور ہوگئے ۔ گڑیا کو پیدا ہونے میں مزید دیر لگی لیکن بالآخر پیدا ہو ہی گئیں ۔ ایک ہم، تین وہ ۔ چار کی چوکڑی جہاں جاتی اودھم مچاتی ۔ ممانی اپنے گھر بلانے سے جھجکتی تھیں ۔ لیکن ہم پرواہ کیے بغیر پہنچ جاتے ۔ ان کے باغ میں جا کر خوب شور مچاتے ۔ تربوز کی بیل جڑوں سے کھودتے ۔ فلسفی کا فلسفہ تھا کہ اس طرح بیل کو سانس لینے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے ۔ فالسے کے درخت کو ہلا ہلا کر ادھ موا کر دیتے ۔ فلسفی کہتا فالسے کو ہاتھ سے توڑنے پر نئے فالسے نہیں نکلتے ۔ سب اس کی بات مان لیتے ۔ درخت سے فالسوں سے زیادہ پتے گرتے ۔ بقول فلسفی زیادہ پتے گرنا درخت کی صحت کے لیے مفید ہے ۔ مگر ممانی کی صحت باغ کی صفائی کے دوران خراب ہوجاتی ۔

ہم نے مزید دو دن رکنے کا پروگرام بنا لیا ۔ ممانی کی صحت مزید خراب ہوگئی ۔

باہر خوب بارش ہورہی تھی ۔ سب باہر آ گئے ۔ چیتے کے ہاتھ میں آصف کی کا پیوں کا ڈھیر تھا ۔ ہم نے کھول کر دیکھا سب بھری ہوئی تھیں ۔

''سادہ کاپیوں کو چھوڑ دیا، ضائع ہوجائیں گی ۔'' چیتے نے اطمینان دلایا ۔

سب نے اطمینان سے کاغذ پھاڑ کر کشتیاں بنائیں اور صاف ستھری موزائیک کی بنی نالیوں میں چلانے لگے۔ یہ نالیاں صرف بارش میں بہتی تھیں۔ تبھی گڑیا ہاتھ میں بڑی سے کشتی اٹھا لائی :

''آصف کے ماموں دبئی سے لائے تھے۔ بیٹری سے چلتی ہے۔''

سب کاغذ کی کشتیاں بھول گئے۔ بیٹری سے چلنے والی کشتی کا شور سن کر ممانی بوکھلائی ہوئی آئیں۔ بچے کی امپورٹیڈ کشتی ہمارے ہاتھوں بگڑتے دیکھ کر بگڑ گئیں :

''بہت مہنگی ہے۔ بارش میں خراب ہو جائے گی۔''

''بارش روز روز نہیں ہوتی۔'' گڑیا نے ممانی کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔

''ابھی اسے خراب ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔'' فلسفی منمنایا۔

''خراب ہونے کے بعد کیا ہو گا؟'' ممانی کچھ اور بگڑ گئیں۔

''ماموں نئی لے آئیں گے۔'' ہماری پیش گوئی تھی۔

ممانی موڈ خراب کر کے چلی گئیں۔

اندر آصف زور زور سے بول رہا تھا : ''میری کاپیاں نہیں مل رہیں۔ ہوم ورک کر کے یہیں رکھی تھیں۔''

سب نے چیتے کو گھورا۔ چیتا خاموشی سے باقی ماندہ کاپیاں واپس رکھ آیا۔ اس روز کاپی کے صفحے پھٹنے کا کسی کو علم نہیں ہوا۔

باہر بارش تیزی سے برسنے لگی۔ پانی زور زور سے بہہ رہا تھا۔ کشتی کی رفتار مزید تیز ہو گئی!!!

(۲)

شام کی چائے بابا نے بنائی۔ بابا خانساماں تھے۔ ممانی ابھی تک بیڈ روم میں تھیں۔ موڈ صحیح نہیں ہوا تھا۔ گڑیا نے ٹرالی میں رکھا جالی سے ڈھکا کیک اٹھا لیا۔

''بے بی نے بنایا ہے۔'' بابا نے اطلاع دی۔

''مہمان روز روز نہیں آتے۔ کیک پھر بن سکتا ہے۔'' گڑیا نے کیک کا پیس منہ میں ٹھونسا۔ کیک مزے کا تھا۔ بعد میں پتا چلا بے بی نے پہلی دفعہ بنایا ہے۔ بے بی کے ہاتھ کی صفائی کے سب قائل ہو گئے!!!

صبح ناشتے کے بعد از سر نو باغ کا معائنہ شروع ہوا۔ چیتا ہاتھوں میں بیجوں کے چھوٹے چھوٹے لفافے اٹھا لایا:

''فریج پر رکھے تھے۔'' نئی اطلاع دی۔

سب نے دل جمعی سے لفافے پھاڑے۔ کھرپی سے جگہ جگہ کیاری کھودی۔ ہر لفافے کے بیج نئے گڑھے میں دبائے۔ گڑھے میں مٹی ڈالی۔ فلسفی گھسیٹ کر پانی کا پائپ لے آیا۔ سب نے خوب پانی بہایا۔ کل کی بارش سے زمین گیلی تھی۔ کیاری پانی سے لبالب بھر گئی۔ اتنے میں باغی بھاگا بھاگا آیا۔ سب اسے مالی کہتے تھے لیکن فلسفی کا کہنا تھا باغ کی نسبت سے اسے باغی ہونا چاہیے۔ بیجوں کے پھٹے ہوئے لفافے اور کیاری میں بھرا پانی دیکھ کر باغی بولا: ''بابا لوگو یہ بیج اگلے موسم کی سبزیوں اور پھولوں کے تھے۔ بیگم صاحبہ ناراض ہوں گی۔''

''انہیں اگلے موسم سے پہلے پانی نہ دیں۔ یہ زمین میں محفوظ رہیں گے۔'' فلسفی کو علم نباتات پر بھی کافی معلومات تھیں۔

رات کو باہر سناٹا اور خنکی تھی۔ اندر موسم گرم تھا۔ سب مونوپلی کھیلنے لگے۔ گڑیا پانچواں کھلاڑی تھی۔ آصف نے زبردستی بینک کا کیشیر بنا دیا۔ اس نے بھی خوب بدلے لیے۔ بینک سے پیسے چراتی اور نظر بچا کر ہماری مٹھیوں میں دبا دیتی۔ آصف کو آخر تک اپنے کنگال اور ہمارے مالامال ہونے کا پتا نہ چل سکا۔

مونوپلی کھیلتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ سب کو بھوک لگنے لگی۔

''میں نے فریج میں بہت ساری چاکلیٹ دیکھی ہیں۔'' گڑیا کی اطلاع پر آصف بپھر گیا۔

''ماموں دبئی سے لائے ہیں۔ کسی نے بھی نہیں چکھیں۔ ابھی کوئی نہیں کھائے گا۔''

سب خاموش ہو گئے۔ آصف سونے چلا گیا۔ ممانی نے آ کر کمرے کی لائٹ بند کر دی۔ تھوڑی دیر بعد گڑیا اٹھی:

''ماموں سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ اور چاکلیٹ بھی۔'' سب نے اتفاق کیا۔

کچن میں اندھیرا تھا لیکن فریج کی لائٹ میں سامنے رکھی چاکلیٹ صاف نظر آ رہی تھیں۔ فریج کا دروازہ کھلا رکھ کر پیٹ بھر کے چاکلیٹ کھائیں۔ پلٹتے وقت دیکھا بالکل سامنے ممانی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ سامنے بیڈ پر سو رہی تھیں۔ شاید ہمیں دیکھ لیا ہو۔ سب کو خدشہ لاحق ہوا۔

''ممانی جاگ رہی تھیں۔ فریج کی روشنی میں ان کی آنکھیں چمکتی دِکھیں۔'' چیتا خوفزدہ تھا۔

''بلی ہوگی۔'' گڑیا نے تسلی دی۔

''بستر پر؟''

''زیادہ نہ سوچو۔ ورنہ وہم سچا ہو جائے گا۔''فلسفی نے کہا۔ سب نے سوچنا چھوڑ دیا۔ وہم سچا نہ ہوا۔ صبح ممانی نے کوئی باز پرس نہ کی۔ مگر آصف شک میں تھا۔ سارا دن عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔ کسی نے پرواہ نہ کی۔ فسلفی کا کہنا تھا جس بات کی جتنی پرواہ کروگے اُتنا پریشان رہوگے۔

(۳)

نعمت خالہ کچن میں تھیں۔ سب چھت پر آ گئے۔ فلسفی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر برابر والوں کی چھت پر چلا گیا۔ وہاں کارٹنوں کا انبار تھا۔ تھوڑی دیر بعد فلسفی ہاتھ میں شیشے کی چھوٹی سی بوتل تھامے آیا۔

''اس میں زہر ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟''

''انگریزی میں پوائزن لکھا ہے۔''انگریزی دانی کا رعب جھاڑا۔

''اسے کس پر آزمائیں؟''سب بے چین ہو گئے۔

''کتے کو کھلا کر دیکھتے ہیں۔''چیتے نے تجویز دی۔

سب نیچے آ گئے۔ لان میں کتا اونگھ رہا تھا۔ اس کی پلیٹ میں دودھ ڈالا۔ اوپر سے زہر کی آدھی بوتل انڈیل دی۔ کتے نے دودھ سونگھا اور چٹ کر گیا۔

''ایک منٹ میں زہر کا اثر ہو جائے گا۔ ''فلسفی کے لہجے میں وثوق تھا۔

سب کئی منٹ بیٹھے رہے لیکن کتے کو کچھ نہیں ہوا۔

''ثابت ہوا آج کل زہر بھی نقلی آ رہا ہے۔ ''فلسفی نے اعلان کیا۔ سب نے سر ہلا دیئے۔

زہر کی آدھی بچی ہوئی شیشی واش بیسن میں انڈیل دی گئی!!!

(۴)

لوگوں کو مصیبت میں نانی یاد آتی ہے ہمیں چھٹیوں میں۔ اسکول میں چھٹیاں تھیں، ہم نانی کے گھر آ گئے۔ انجم بھی آ گئی۔ نانی کے گھر کا دروازہ انجم کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ انجم کا ناک نقشہ ایسا نہ تھا جسے فخریہ بیان کیا جائے۔ بھاری جسم اور پکا رنگ۔ اس پہ اس کا اعتماد سب کا خون کھولاتا۔

''مجھے اس اعتماد کا راز پتا ہے ''فلسفی بولا۔

''کیا؟''

''نکڑ پہ بیٹھے بھائی کلّن۔ ''فلسفی نے انکشاف کیا۔

''وہ کیسے؟''

''دونوں کے درمیان پرچہ بازی ہوتی ہے ''اس کا لہجہ پراسرار ہو گیا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''گڑیا دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کر اس کے پاس آ گئی۔

''ایک مرتبہ مجھ سے بھی پرچی بھجوائی تھی ''بے ساختہ بول دیا۔

''تم نے اس کی پرچی کلن کو دی تھی؟''گڑیا اس کے سامنے آ گئی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا لالچ دیا تھا؟''گڑیا کو غصہ آنے لگا۔

''پان کا''

''نانی کو بتاؤں؟''

''رہنے دو۔ اس نے پان نہیں کھلایا۔ اس کا بدلہ لینا چاہیے''فلسفی دھمکی خاطر میں نہ لایا۔

''کیا کر سکتے ہو؟''چیتے نے پوچھا۔

''سوچتے ہیں''

ان دنوں اشتیاق احمد کے ناول پڑھنے کا بھوت سوار تھا۔ فلسفی ابن صفی کے ناول بھی لے آیا۔ ہم نے ایک ناول پڑھا۔ ختم کرنے کے بعد بھی پتا نہ چلا کہ کیا پڑھا۔ ہم نے پڑھنا چھوڑ دیا۔

''ایک آئیڈیا ہے''ہم نے سب کو متوجہ کیا۔ سب متوجہ ہو گئے۔

''انجم کو اغوا کر لیتے ہیں''

''چار آنے بھی نہیں لگیں گے''فلسفی نے منع کر دیا۔

''آئیڈیا''چیتے نے چٹکی بجائی۔ سب بور ہو گئے۔

''سن تو لو''سب جماہیاں لینے لگے۔ اس نے پرواہ نہ کی۔ مسلسل بولنے لگا۔ سب مسلسل سننے لگے۔

''ایک پرچہ لکھتے ہیں۔ اگر پیسوں سے بھرا بریف کیس شمالی پہاڑیوں پہ نہ رکھا تو انجم کو اغوا کر لیں گے''

''شمالی پہاڑیاں کہاں ہوتی ہیں؟''فلسفی کو حیرت ہوئی۔

''اشتیاق احمد کے ناول میں''چیتا غرایا۔

''بریف کیس زیادہ بڑا نہیں ہو جائے گا۔ اس کی جگہ تھیلی کر لو۔ دینے میں آسانی رہے گی''انجم کے بدلہ میں بریف کیس جتنی رقم فلسفی کو ہضم نہیں ہوئی۔

''تھیلی غیر جاسوسی لفظ ہے۔ کسی مجرم کو تھیلی میں رقم لیتے نہیں سنا''چیتے نے آئیڈیا مسترد کر دیا۔

''تم نے ہمیں مجرم کہا؟''گڑیا غرائی۔

''بے وقوف مت بنو۔ اور کاغذ قلم لے کر آؤ''چیتے نے کام پر لگا دیا۔

''کیوں؟''

''خط لکھنا ہے''فلسفی ساری بات سمجھ گیا۔ خط فلسفی نے لکھا۔ ہمارے نزدیک سب سے پختہ رائٹنگ اسی کی تھی۔ خط انجم کے ابا کے نام لکھا گیا۔

''محترم انکل السلام علیکم۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اگر آپ نے رقم سے بھرا بریف کیس شمالی پہاڑیوں پہ نہ رکھا تو ہم انجم کو اغوا کرلیں گے''

''یہ کچھ عجیب سا نہیں ہے؟''ہمیں کھٹکنے لگا۔

''اس طرح کا خط کسی مجرم کا یاد نہیں آرہا''ہم نے اپنے خدشات ظاہر کیے ۔

''تمہیں نہیں پتا۔ ابن صفی کے مجرم ایسے ہی لکھتے ہیں''ہم متاثر ہو گئے۔ خط دروازے سے اندر ڈالنے کی ذمہ داری ہماری لگی۔ دوپہر کے سناٹے میں خط ڈالنے گئے۔ جاتے وقت جتنی تیزی دکھائی، واپسی پر رفتار اس سے تین گنا زیادہ تھی۔

اب شام کا انتظار شروع ہو گیا۔

شام کو انجم کی اماں ہاتھ میں خط لیے آگئیں ۔ تیر کی طرح نانی کے پاس پہنچیں ۔ بچوں کی رائٹنگ پہچان لی گئی تھی۔ ایسی چوکڑی محلہ بھر میں نہیں تھی۔ بقول نانی شریفوں کا محلہ تھا۔ انجم کی اماں آگ لگا گئیں ۔ نانی نے سب کو بلالیا۔

''کم بختو دھمکی نامہ لکھا ہے یا خیریت نامہ۔ یا تو سلام دعا کرلو، خیریتیں پوچھ لو یا لڑکیاں اٹھوالو۔ ناک کٹا دی محلہ بھر میں ۔ آنے دو نانا کو''نانی کو ہنسی آرہی تھی۔ لیکن موقع غصہ کرنے کا تھا۔ سو غصہ دکھانے لگیں ۔

نانی خط ہمارے حوالے کر کے چلی گئیں ۔ ہم نے دوبارہ خط پڑھا۔

''محترم انکل السلام علیکم۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے ۔۔۔۔''

''اسی پر تو ہم کھٹک رہے تھے''ہم نے اعلان کیا۔ سب فلسفی کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگے!!!

رات کو نانا آ گئے ۔ نانا مارنے پر گھڑ کنے کو ترجیح دیتے تھے ۔

تین دن تک مسلسل گھڑ کتے رہے !!!

(۵)

فلسفی کو پیسوں کی ضرورت تھی ۔ نعمت خالہ کے پاس گیا ۔ انہوں نے ہری جھنڈی دکھا دی ۔ وہ باہر سے مٹّی کی نئی گلک لے آیا ۔

''خالی گلک سے پیسے ملیں گے ؟'' ہم نے پوچھا ۔

''پیسے ہر جگہ سے مل سکتے ہیں ۔ ہاتھ میں ہنر ہونا چاہیے ۔'' فلسفہ بگھار کر لان میں آ گیا ۔ کیاری کی خشک مٹّی گلک پر رگڑی ۔ اس کی آب و تاب ماند ہو گئی ۔ جھاڑ پونچھ کر اندر لایا ۔ اسٹول اٹھایا اور الماری پر رکھی گڑیا کی گلک اتار لی ۔ کافی وزنی تھی ۔ توڑی تو خوب سارے پیسے نکلے ۔ تھوڑے سے پیسے نئی گلک میں ڈالے ، باقی اپنی جیب میں ۔ گڑیا جب پیسے ڈالنے گلک اٹھاتی نعمت خالہ کے پاس ضرور آتی :

''یہ ہلکی کیوں لگ رہی ہے ؟''

''وہم ہو گا ۔''

''وہم سے وزن کم ہو جاتا ہے کیا ؟'' گڑیا ہمیشہ وہم میں مبتلا رہی !!!

(٦)

گرمیوں کی دوپہر تھی ۔ باہر ہُو کا عالم ۔ آدم نہ آدم زاد ۔ بڑے سارے ڈرائنگ روم میں سب صوفوں پر اِدھر اُدھر پڑے تھے ۔ فلسفی طلسم ہوش رُبا کی جلدیں لے آیا ۔ سب کے ہاتھ میں ایک ایک جلد تھما دی ۔ ایک خود لے کر صوفے پر دراز ہو گیا ۔ کچھ دیر بعد بولا : ''اگر ہم عمرو عیار کی طرح سبز چادر اوڑھ لیں تو کسی کو نظر نہیں آئیں گے ۔''

سب بے یقینی سے دیکھنے لگے ۔ وہ سبز چادر لے آیا ۔ سر سے پاؤں تک اوڑھ کر پوچھا : ''کسی کو نظر آ رہا ہوں ؟''

چیتے نے دبوچ لیا۔ وہ چادر کے اندر کسمسایا تو چھوڑ دیا۔ جھینپتے ہوئے بولا: ''دوسروں کو نظر نہیں آئیں گے۔''

کسی کو یقین نہ آیا، پھر بھی چادر اوڑھے باہر آئے، پڑوسیوں کے دروازوں کی گھنٹیاں بجائیں اور اطمینان سے ٹہلتے ہوئے واپس آ گئے۔

''دیکھا ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔ ''فلسفی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ سب کو یقین آ گیا۔

شام کی چائے پر سب ڈائننگ ٹیبل پہ جمع تھے۔ باہر دروازے کی گھنٹی بجی۔ خالو باہر گئے، واپس آ کر ہمیں گھورنے لگے۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ خالو گئے۔ اب کے آئے تو گھورنے کی تیزی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گھنٹی تیسری بار بجی۔ سب کو ساتھ لے گئے۔ دروازہ پر نیازی صاحب تھے۔ کہنے لگے: ''صاحب، چاروں بچوں نے ساری دوپہر سونے نہیں دیا۔ گھنٹیاں بجا بجا کر سر میں درد کر دیا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ کیا سمجھتے ہیں چادر اوڑھ لیں گے تو پہچانے نہیں جائیں گے؟''

سب نے فلسفی کو دیکھا۔ وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔

خالو کی ہوش رُبا کھنچائی کے بعد عمرو عیار اور اس کی سبز چادر سے ہمیشہ کے لیے اعتبار اُٹھ گیا۔

اگلے روز طلسم ہوش رُبا کی جلدیں کباڑیے کو بیچ دی گئیں!!!

* * *

تنقید علی التحریص برائے دلفریب و دلنشین و لیکن مہمل اسمائے اطفال

۔۔۔ محمد احمد

ویسے تو آپ عنوان دیکھ کر ہی سمجھ گئے ہوں گے اور تحریر لکھنا محض وقت کا زیاں ہی ہوگا۔ تاہم فالتو کی تحریریں لکھنے کی چاٹ ہے کہ کہتی ہے کہ محض عنوان کافی نہ ہوگا بلکہ اچھا خاصا ٹھوک بجا کر تحریر لکھنا اور اُسے جا بجا چھاپنا اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو جبراً پڑھوانا انتہائی ضروری ہے۔ چھپوانا ہم نے اس لئے نہیں لکھا کہ ہم اُس کٹھن دور میں پیدا نہیں ہوئے کہ جب تحریریں چھپوانے کے لئے ہفتوں پہلے سے رسالے کے مُدیران کو روزانہ پان کی گلوریاں بھجوانی پڑتی تھیں اور پان کی گلوریوں کی عدم موجودگی میں تحریر غیر معیاری قرار پا کر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی تھی۔

خیر! موضوع پر تو ہم اتنی جلدی نہیں آنے کے، فی الحال کچھ عنوان کی خبر لے لیں۔

ہمارے ہاں دفتری زبان میں جو خطوط لکھے جاتے ہیں خصوصاً سرکاری محکموں میں، اُن میں کم و بیش سارا ہی معاملہ خط کے عنوان میں ہی لکھ دیا جاتا ہے اور پھر پورے خط میں عنوان کے حوالے دے دے کر ناک میں دم کیا جاتا ہے۔ یعنی بین السطور یہ باور کروایا جاتا ہے کہ اگر ایک بار ڈھنگ سے عنوان پڑھ لیا ہوتا تو یوں خط کی گلیوں یعنی سطور میں خاک نہیں چھاننا پڑتی۔

لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لینے والے سرکاری دفتروں میں بیٹھے کہنہ سال گھاگ افسران بھی محض لفافے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ خط کا عنوان پڑھ کر ہی ضروری ہدایات اور غیر ضروری طعنے اپنے ماتحتوں کو دیا کرتے ہیں اور

اکثر خط کے عنوان کے جواب میں ایک اور عنوان لکھ کر ماتحتوں کو اُس عنوان کے تحت خط لکھنے کی ہدایت بھی جاری کر دیتے ہیں۔

اکثر خطوط کے عنوان ایسے ہوتے ہیں جو سالوں برسوں چلتے رہتے ہیں اور لکھنے والے ہر بار اُنہی کے حوالے دے دے کر ساری دفتری زندگی گزار دیتے ہیں۔ یعنی:

ع - خط لکھیں گے چاہے مطلب کچھ نہ ہو

خیر بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں آ گئی، بلکہ یوں کہیے کہ بات تو ابھی تک چلی ہی نہیں اور اب تک ہم قاری کی استعداد و فہم و ادراک پر ہی گزارا چلاتے آ رہے ہیں کہ وہ عنوان دیکھ کر ہی نصیحت پکڑیں اور مذکورہ و غیر مذکورہ بد عنوانی سے باز آنے کا اصولی فیصلہ کریں۔

تاہم سچی بات یہ ہے کہ ہم قاری کی فہم پر کامل بھروسہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے اور عنوان کے تحت چار چھ سطریں گھسیٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم عنوان میں دی گئی مشکل اصطلاحات کی فرہنگ پیش کر دیں۔

تنقید: یہ ہمیشہ دوسروں پر کی جاتی ہے اور جب کوئی آپ سے بڑھ کر نکتہ چینی کرنے والا مل جائے اور آپ کی ذات کو ہدفِ تنقید بنائے تو اُسے تنقید کے لغوی معنی بتا کر مرغیوں کے خاک سے دانے علیحدہ کرنے کی مثال میں اُلجھایا جا سکتا ہے، اور یہ بھی باور کروایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر حقیر کام میں اپنا وقت خراب کر رہا ہے۔ پھر بھی نہ مانے تو نو نقد نہ تیرہ اُدھار کی دو دھاری تلوار سے محارب کی زبان درازی کو لگام دی جا سکتی ہے۔ البتہ تنقید کا نقد سے اُتنا ہی تعلق ہے جتنا ہمارے ہاں تنقید نگاروں کا مالی خوشحالی اور فارغ البالی سے ہوا کرتا ہے۔

تحریص: تحریص کا لفظ لکھنے کی حرص بخدا ہمیں ہرگز نہیں تھی اور ہم تو انگریزی کا لفظ (Temptation) لکھنا چاہ رہے تھے لیکن اپنے ہی فرمودات عبث سے خوف کھا کر اردو میں انگریزی ملانے سے گریز کیا۔ تحریص کا مطلب وہی ہے جو آپ پہلے سے جانتے ہیں، ہم اسے کوئی نئے معنی پہنانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

دلفریب : یہ ایک مرکب اصطلاح ہے اور بہتر یہ ہے کہ اسے مرکب صورت میں ہی فرہنگ کے حوالے کیا جائے ورنہ دل کے اپنے سوڈرامے ہیں اور فریب تو ہے ہی فریبیوں سے ملاقات کی سبیل ۔ دل فریب سے مراد دل کو لبھانے والا۔ اور دل بقول شخصے بچہ ہوتا ہے یا بچے کی مانند ہوتا ہے اور ظاہری چمک دمک پر ہی فریفتہ ہو جاتا ہے ۔

دل نشین : دل میں رہنے والا یا دل میں اُتر جانے والا ۔ بقول شاعر : شاید کے تیرے دل میں اُتر جائے مری بات (یعنی عنوانی نصیحت) ۔ ۔ ۔ !اور بقول دوسرے شاعر :

نصیحت دل نشیں رکھتا ہوں اُن خاموش آنکھوں کی

مگر بندہ بشر ہوں رفتہ رفتہ بھول جاتا ہوں

لیکن : لیکن کا مطلب ہے ٹانگ اڑانا ۔ جیسے آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہو گا کہ بھئی بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن ۔ ۔ ۔ یعنی بات آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہم اپنی ٹانگ اڑائے بغیر باز نہیں آئیں گے ۔

مُہمل : اگر ہم مُہمل کے لئے لغت میں موجود سارے معنی لکھ ماریں تو آپ یقیناً ہماری لغت نگاری بلکہ لغت نقالی سے عاجز آ جائیں گے ، اس لئے سب معنی رہنے دیتے ہیں بس اتنا سمجھ لیجے کہ قاعدے کی رو سے ایسے الفاظ جن کے کوئی معنی نہ ہوں اُنہیں مُہمل کہا جاتا ہے ۔

اسماء : اسم یعنی نام کی جمع ۔ اب یہ بھی میں بتاؤں ۔

اطفال : اطفال وہی ، جن کی بابت حکومت دو سے زیادہ کی اجازت دینے پر راضی نہیں ہے اور عوام دو پر اکتفا کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں ۔ اب بھی اگر نہیں سمجھ آیا تو غالب کے بازیچۂ اطفال میں سے بازیچے کو دیس نکالا دے کر باقیات کی واحد بنائیں اور طفل تسلیوں سے دل بہلائیں ۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فرہنگ ختم ہوتے ہی آپ واپس عنوان پر جاتے اور اُسے اپنے تئیں سمجھنے کی کوشش کرتے ۔ لیکن ہم آپ کو جانتے ہیں ۔ آپ ایسے نہیں مانیں گے ۔ کیونکہ آپ ویسے بھی نہیں مانتے ۔

اور جب آپ ایسے بھی نہیں مانتے اور ویسے بھی نہیں مانتے تو پھر اتنے بڑے ناصحانہ کھڑاگ کا فائدہ ہی کیا ہے ؟ آپ شاید بھول گئے ، وہی فالتو کی تحریریں لکھنے کی چاٹ اور ان چاہی نصیحتوں کے طومار باندھنا اور جا بے جا حظ اُٹھانا ۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا نے آپ کو اولاد دے ہی دی ہے تو آلتو فالتو ویب سائٹس پر جا کر چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بے مطلب ناموں کو اپنے بچوں پر تھوپ دینے کی ہرگز کوشش نہ کریں بلکہ ہمیشہ اچھے اور باقاعدہ معنوں والے احسن نام اپنے بچوں کے لئے منتخب کریں۔ تاکہ کل کو جب آپ کے بچے کسی کو اپنے نام کا مطلب بتائیں تو کوئی سنکی لغت آشنا اُن کے ڈھائی گھنٹے خراب نہ کرے۔

* * *

ایک بے کل گزاری ہوئی اتوار کی صبح ۔ ۔ ۔ محمد خلیل الرحمٰن

تمہید :

اتوار کی خوبصورت صبح جوں ہی ہمارے چہرے پر طلوع ہوئی، یعنی ہماری نصف بہتر نے ہمارے چہرے پر سے چادر ہٹاتے ہوئے ہمیں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ ہمارا پیارا اخبار پانی سے بھری ہوئی بالٹی کی نذر ہوچکا ہے، ہم بے چین ہو گئے۔ اتوار کی خوبصورت صبح گئی بھاڑ میں، اور تمام تر سُکھ چین اِس بے کلی کی نذر ہوئے۔

اتوار کی صبح ایک مہذب انسان کے لیے سب سے خوش گوار وہ لمحات ہوتے ہیں جب آنکھ کھلتے ہی بیگم کی سُریلی آواز کانوں میں رس گھولتی ہے : ''لیجیے یہ آپ کا نگوڑا اخبار آگیا ہے۔''

اب ہم اخبار کو بائیں ہاتھ سے تھامتے ہیں، آنکھیں بند کیے ہی اسے کھولنے کی تگ و دو کرتے ہیں، داہنے ہاتھ سے اپنی عینک سنبھالتے ہوئے اسے اپنی ناک پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ سے یوں گویا ہوتے ہیں : ''بیٹا! لو اب آنکھیں کھولو''۔ اخبار میں خبروں کا سیکشن، مقامی سیکشن اور کتب کی دنیا کے علاوہ ایک اور اہم حصہ ہمارا منتظر ہوتا ہے جہاں حسینانِ جہاں کی رنگین اور خوبصورت تصویریں سجی ہوتی ہیں۔ ہم دنیا ومافیہا سے بے خبر اس حسین دنیا میں کھوسے جاتے ہیں۔ ہالی وڈ، بالی وڈ اور لالی وڈ کی چٹ پٹی خبریں اور حسینانِ ختن کی شوخ و چنچل، اداؤں بھری رنگ برنگی تصویریں۔

لیکن آج یہ کیا غضب ہوگیا۔ آن کی آن میں یہ کیا ماجرا ہوگیا کہ اخبار کا اخبار پانی میں شرابور ہوگیا۔ ہائے حسینانِ ختن! کے پانی میں بھیگے ہوئے چہرے۔۔۔ اُف وہ توبہ شکن حسنِ نمکین۔۔ ہمارا مطلب ہے، ارے کوئی ہے جو اس اخبار کو خشک کر دے تاکہ ہم گزرے ہوئے کل کی وہ خبریں پڑھ سکیں جنہیں ٹی وی اسکرین پر نہیں دیکھ سکے تھے۔ اور اس طرح اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ مطالعہ علم حاصل کرنے کا ایک بڑا اہم ذریعہ ہے۔

اپنی اس دُہائی کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ پا کر ہم نے صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے کی ٹھانی اور رسائل بہ عمل ہو گئے۔۔

پس منظر:

ہمارا اخبار والا روز کا اخبار تو کچن کی بالکونی سے اوپر پھینکتا ہے، البتہ اتوار کا اخبار ضخیم ہونے کی وجہ سے اوپر آکر دروازے کی نچلی درز سے اندر سرکا دیتا ہے۔ یہ اس کا معمول ہے۔

پیش منظر:

آج چونکہ ہمارا معمول کا اخبار والا چھٹی پر تھا لہٰذا اس کی جگہ لینے والے نے اتوار کا ضخیم اخبار بھی بنڈل بنا کر بالکونی سے اوپر کی جانب اچھال دیا۔ حسنِ اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق، کل رات پانی کی فراہمی میں تعطل کے پیشِ نظر ہماری نصف بہتر نے (حفظِ ما تقدم کے طور پر) کچن کی بالکونی میں ایک عدد بالٹی پانی سے بھری رکھ چھوڑی تھی تاکہ سحری میں برتن دھونے کے کام آئے۔ وہ بالٹی اس طرح داشتہ آید بکار کے مصداق کام آئی کہ اخبار نے فوراً اس کے اندر گھر کیا اور مآلِ کار ہمارے چہرے پر چھینٹے اُڑاتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں آیا۔

اشیائے ضرورت:

ہمارے اِس تجربے کے لیے مندرجہ ذیل نکات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے

1۔ برقی رو کی فراہمی میں تعطل نہ ہو۔

2۔ اخبار اتوار ہی کا ہو

3۔ گھر میں موجود بجلی کی استری قابلِ استعمال ہو اور اس میں کوئی بنیادی نقص نہ ہو۔

ہمارا کامیاب تجربہ :

ہم نے سب سے پہلے احتیاط کے جملہ تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خبروں کا حصہ اُٹھایا اور اس کے صفحات پر نہایت احتیاط سے استری پھیرتے چلے گئے۔ جب وہ کافی حد تک خشک ہو گیا تو اسے اپنے بستر پر ہلکے پنکھے میں سوکھنے کے لیے پھیلا دیا۔ پھر مقامی سیکشن پر ہاتھ صاف کیا اور سب سے آخر میں کتب دنیا پر اچھی طرح تجربہ کرنے کے بعد ہم تیار تھے کہ اپنے پسندیدہ اتوار میگزین کو خشک کریں جہاں پر چند حسینوں کے پانی میں بھیگے ہوئے نمکین چہرے ہمارے منتظر تھے۔ لیکن!!! نصف بہتر کی قہر آلود نظروں نے ہمیں اس منصوبے پر عمل درآمد سے باز رکھا اور ہم ان خوب صورت چہروں کو بستر پر پھیلا کر باقی ماندہ خشک اخبار کی بے مقصد ورق گردانی اور وقت گزاری کرنے لگے۔

ہمارا ناکام انجام :

انتظار، انتظار، انتظار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے نسیمِ صبح!، جلد اِس پانی کو خشک کر دے تاکہ ہم ان حسیناؤں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے سہانے دِن کا آغاز کر سکیں۔

سبق :

اس تجربے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اخبار پڑھتے وقت، خاص طور پر حسینوں کے گداز چہروں پر نظر ڈالتے وقت، خیال رکھیے کہ بیگم صاحبہ کچن میں مصروف ہیں۔ ان کے قریب آتے ہی خبروں والے حصے کا بغور مطالعہ شروع کر

دیکھیے کہ سیاست، صحافت، مذہب، دِگرگوں سماجی و معاشرتی حالات ہی آپ کے مطالعۂ اخبار کا مطمحِ نظر ہیں۔

خبردار

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری

کا راز کہیں بیگم پر افشا نہ ہو جائے۔

* * *

غزلیات

محمد تابشؔ صدیقی

لوگ خوش ہیں کہ سال بدلے گا
کیا ہمارا یہ حال بدلے گا؟
ہو گئے ہر ستم کے ہم عادی
اب تو ظالم ہی چال بدلے گا
دل بدلتا نہیں ہے کہنے سے
اشکِ توبہ میں ڈھال، بدلے گا
کون بدلے گا ملک کے حالات؟
کیا کبھی یہ سوال بدلے گا؟
ہم نے بدلی نہیں رَوِش تابشؔ
کیسے کہہ دوں مآل بدلے گا

* * *

محمد احمد

اوس کہتی ہے رات روئی ہے
ابر کہتا ہے اور کوئی ہے

اشک قرطاسِ دل پہ برسے ہیں
حرف و معنی کی فصل بوئی ہے

میں تمھاری طرح نہ بن پایا
میں نے اپنی شناخت کھوئی ہے

نا خُدا نے خدا خدا کر کے
تیرتی ناؤ لا ڈبوئی ہے

جاگتے خواب مجھ سے کہتے ہیں
نیند کن وادیوں میں سوئی ہے

خود کلامی کی خُو نہیں جاتی
کچھ نہیں ہے تو شعر گوئی ہے

کیا اُنہیں حالِ دل بتا دوں میں
وہ جنہیں زعمِ اشک شوئی ہے

نیند اُڑنے لگی تھی سوچ کے کچھ

میں نے پلکوں پہ لا پِروئی ہے

* * *

منذر رضا

دستِ خزاں دراز ہے، فصلِ بہار دے

ورنہ کرم کا تاج مطّلا اتار دے

بیحد الجھ گئی ہے مقدر کی زلفِ ناز

اپنے حنائی ہاتھ سے اس کو سنوار دے

دل بے قرار ہے تری فرقت میں اے نگار!

اک وعدۂ وصال سے اس کو قرار دے

دے گی نہ تجھ کو کچھ یہ محبت بجز الم

تو اس پہ کل متاع بصد شوق وار دے

یارب! میں بسکہ کشتۂ تیغِ جفا ہوا

میدانِ زیست سے مجھے اذنِ فرار دے

لپکوں گا اس طرف بھی بصد شوق گر خدا

آلامِ روزگار کو آوازِ یار دے!

* * *

ظہیر احمد ظہیرؔ

کوئی فخرِ زہد و تقویٰ ، نہ غرورِ پارسائی
مجھے سب خبر ہے کیا ہے مرے نفس کی کمائی

مجھے جب کبھی اندھیرے ملے راہِ جستجو میں
نئی مشعلِ تمنا ترے نام کی جلائی

مجھے فخر ہے کہ میں ہوں ، ہے مرا شمار ممکن
مرے صفر سے ہے پہلے تری ذات کی اکائی

مرے چارہ گر سے کہہ دو یہ مرض ہے آگہی کا
نہ کرے گی کام اِس میں کوئی نیند کی دوائی

وہ جو ضبط سے نہ نکلا ، کبھی نطق تک نہ پہنچا
اُسی حرفِ نارسا کی ہوئی عرش تک رسائی

نہ جھکا سکے جو سر کو وہ عمامۂ فضیلت
سرِ بزم علم و دانش ہے کلاہِ خود نمائی

مری چشمِ خوش گماں تو مری دوست ہے کہ دشمن
تو نے خواب ایسے دیکھے مجھے نیند ہی نہ آئی

ہیں بجھے بجھے سے دونوں ، سبھی رونقوں سے خالی

مری بزمِ ترکِ الفت، ترا جشنِ بے وفائی

کہیں لے گئیں ہوائیں وہ محبتوں کے فانوس

شب و روز بجھ رہے ہیں مہ و سالِ آشنائی

**

غم کوئی دل میں ترے بعد نہیں آئے گا

سنگِ ارزاں سرِ بنیاد نہیں آئے گا

دن نکلتے ہی بھلا دوں گا میں اندیشۂ روز

سرحدِ صبح میں شب زاد نہیں آئے گا

ایسے اک طاقِ تمنا پہ رکھ آیا ہوں چراغ

بجھ گیا بھی تو مجھے یاد نہیں آئے گا

حسنِ خوددار کو اس دورِ خود آرا میں بہم

ہنرِ مانی و بہزاد نہیں آئے گا

فرقِ زندان و گلستان بھی سب دیکھ لیا

لب پر اب شکوۂ صیاد نہیں آئے گا

طوقِ زرناب ہوئے زیبِ گلوئے گفتار

اب کہیں سے سخن آزاد نہیں آئے گا

کس ہوا میں ہو تم اے راہ نوردانِ فراق
اب کوئی قریۂ آباد نہیں آئے گا
اب کسی شعبدہ گر دامِ عنایت میں ظہیرؔ
یہ دلِ خوگرِ بیداد نہیں آئے گا
* * *

فائضہ خان

کسی کی تسبیح سے گری ہوں میں مثلِ موتی بکھر گئی ہوں

کسی کے دل میں اُتر گئی ہوں، کسی کے دل سے اُتر گئی ہوں

ہیں زائرینِ حرم ہراساں، صنم کدوں میں صنم پریشاں

ترے جہاں سے مرے خدایا، شناسا ہوتے ہی ڈر گئی ہوں

بڑا قلق تھا بڑی خلش تھی، سنور رہی تھی میں دھیرے دھیرے

بڑا مزہ ہے بڑی عطا ہے، بڑے سکوں سے بکھر گئی ہوں

مرے شناسا تری شناسائی کیا تماشا یہ کر گئی ہے

تھی اجنبیت سی اجنبیت، کبھی جو اپنے میں گھر گئی ہوں

وہ چشمِ حیرت، لبِ تبسم، عجیب جادو سا کر گئے ہیں

کسی کی صورت میں ڈھل گئی ہوں، بدل گئی ہوں، نکھر گئی ہوں

* * *

عمران سرگانی

تمہیں کیسے بتائیں، سب امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں
کہ جب تم روٹھتے ہو، چاہتیں بھی روٹھ جاتی ہیں

برہنہ پاؤں چلنا پڑ گیا پُرخار صحرا میں
محبت کے سفر میں جوتیاں تک ٹوٹ جاتی ہیں

ترے بدلے ہوئے تیور مجھے جب یاد آتے ہیں
نہ جانے کیوں مرے ہاتھوں سے چیزیں چھوٹ جاتی ہیں

کہیں اس کے چلے آنے سے گل کھلتے ہیں صحرا میں
کہیں سوکھے ہوئے پیڑوں سے شاخیں پھوٹ جاتی ہیں

مجھے مایوس ہونے پر کہیں، تُو لوٹ آئے گا
تری یادیں ہمیشہ بول کر یہ جھوٹ جاتی ہیں

نہیں ممکن، مقدر ساتھ دے ہر بار الفت میں
یہاں لوگوں کی اچھی قسمتیں تک پھوٹ جاتی ہیں

کبھی رہتا نہیں رشتہ کوئی مضبوط دنیا میں
یہاں برسوں پرانی یاریاں بھی ٹوٹ جاتی ہیں

ہمیشہ دیر سے گھر سے نکلتا ہوں جو میں عمران
مری منزل کو جاتی گاڑیاں سب چھوٹ جاتی ہیں
**

تو سوچتا ہے یہ لوگ رانجھے کو ہیر دیں گے؟
یہ بھیڑیے نوچ کر بدن اس کا چیر دیں گے
تمہارا دشمن نشانہ باندھے گا تب ہی تم پر
جو دوست جا کر کمان میں اس کی تیر دیں گے
تری بصارت سے رنگ چھینیں گے زندگی کے
نہ دیکھ، رنگین خواب آنکھوں کو نیر دیں گے
تمہارے آگے جو چاند بھی ماند پڑ گیا ہے
تو ہم تمہارے جمال کی کیا نظیر دیں گے؟
جو اہلِ ثروت سے چاہتے ہو، نہیں ملے گا
اگر ضرورت ہو جان کی، بس فقیر دیں گے
نبی ﷺ کی مدحت بیان کرنے سے روزِ محشر
بصد مسرت وہ تجھ کو اجرِ کثیر دیں گے
ہماری دنیا کے بیچ عمران ہو گی سرحد
کہ لوگ قسمت میں کھینچ ایسی لکیر دیں گے
***

عاطفؔ ملک

خلق میں ایک ہی تو نام نہیں

شاعری اس ہی پر تمام نہیں

اب وہ پہلے سے صبح و شام نہیں

اس کی گلیوں میں اب قیام نہیں

آج ہم ہو گئے خفا اس سے

یہ بھی چاہت کا تو مقام نہیں

کیوں کریں یاد ہر گھڑی اس کو

کیا ہمیں اور کوئی کام نہیں

دل کے بدلے میں دل ملے بھی تو کیوں

چاہتیں ''بارٹر'' نظام نہیں

میں اسی کا ہوں سر سے پاؤں تلک

اس میں ہرگز کوئی کلام نہیں

جاں چھڑکتے تھے جن پہ آپ کبھی

آج اُن سے دعا سلام نہیں

عمر بھر ایک ہی سے ہو کے رہے

عشق کو ایسا بھی دوام نہیں

فرقتیں گر نہ ہوں مقدر میں

عاشقی مشغلہ ہے کام نہیں

منحصر اس کے ذوق پر بھی ہے

شعر عاطفؔ تمہارا خام نہیں

* * *

نظمیں

سموگ زدہ لاہور کی ایک بارش کے بعد ۔ ۔ ۔ وجیہہ بخاری

پھر آج وہی بھولا بِسرا

وہ رنگ زمیں پر ہے اترا

پھر آج وہی خوشبو آئی

جب برسا ہے پہلا قطرہ

موسم نے دل پر دستک دی

اک یاد جگاتا ہے بَدرا

بھیگی رُت مجھ سے کہتی ہے

اُس چاہت کا قصّہ دُہرا

وہ چاہت جس کی باہوں میں

جانے کتنا عرصہ گزرا

اُس چاہت کے موسم میں کبھی

سب لگتا تھا نکھرا نکھرا

ہر چیز یہاں پر اپنی تھی
جنگل، دریا، پربت، صحرا
پھر اک دن یہ سب چھوڑ کے میں
اک اور نگر میں جا ٹھہرا
اب لوٹ تو آیا ہوں لیکن
مانوس نہیں کوئی چہرہ
اپنوں کی کھوج کروں کیسے
جب شہر پہ چھایا ہو کُہرہ
یہ دیس تو ایسا لگتا ہے
اک باغ خزاں میں ہو بکھرا
اب پھول کہاں لہرائیں گے
آلودہ ہے ذرّہ ذرّہ
لیکن پھر بھیگ گیا موسم
یک دم چھایا بادل گہرا
پھر آج وہی خوشبو آئی
جب برسا ہے پہلا قطرہ
***

دکھ کے موسم ۔۔۔ محمد خلیل الرحمٰن

پارسال جب کوئل اپنے گھر کے آنگن کو کنے آئی ہم نے سوچا تھا

اس برِہن کا دکھ بھی کتنا گہرا ہے

آج بھی جیسے تیسے کرتے رات بتائی

اب یہ سوچا ہے

آج بھی کوئل اپنے آنگن کو کے گی تو پوچھیں گے

اے پاپن کیا

گرما کی لمبی دوپہریں بھی

دکھ کے موسم ہوتے ہیں؟

***

نظمِ معری ۔۔۔ منذر رضا

بے رنگ ہے جریدۂ تن کا ہر اک ورق

بے نور ہے چراغِ دل و جاں کی ہر کرن

بے سوز ہے صدائے ربابِ حیات بھی

بے کار ہے مرے دلِ بیکس کی آہ بھی

وہ عشق کے گہر، وہ محبت کے لعل بھی

وہ درد کے عقیق، وہ حسرت کے سب نگیں

جو مثلِ آفتاب تھے میری حیات میں

سب خاکِ دشتِ عشق و جنوں میں گما دیے

وہ رنگ جو کہ زینتِ نقشِ حیات تھا

وہ چشمِ خوں فشار سے خوں بن کے بہہ گیا

جس نور سے تھی شمعِ دل و جاں میں روشنی

اس کو ہوائے ہجرِ مسلسل بجھا گئی

وہ سوزِ آرزو، وہ تمنا کی جستجو

وہ دردِ عاشقی کی خلش، کیوں فنا ہوئی

اور گردِ بادِ یاس میں کچھ ایسے چھپ گئی

جیسے کبھی نہ آئی تھی ظالم وجود میں

وہ آہِ نیم شب، وہ فغاں، روزِ ہجر کی

سب خوابِ صبحِ یاس کی مانند مٹ گئیں

یعنی مرا تمام اثاثہ فنا ہوا

یعنی مرا وجود بھی مجھ سے جدا ہوا

* * *

روزِ حساب ۔ ۔ ۔ محمد ریحان قریشی

یہ جو لغزشوں کے ہیں سلسلے کوئی ان کا روزِ شکست ہو
مرے مہرباں کوئی دن تو ہو
کوئی ایسا دن
کوئی دن کہ جب ترا امتحاں مری خستگی کا بھرم رکھے
مری بے بسی نہ عیاں کرے
مری بے دلی کو نہ جوش دے
مری یاسِ خفتہ کی نیند میں بھی مخل نہ ہو
کوئی سرخوشی کوئی حوصلہ پسِ دوش دے
کوئی ایسا دن مرے مہرباں
ترے محشروں سے مرا وجود بکھر چکا
تری منصفی کے اصول بھی تو ہیں خشمناک مرے لیے
ترا کون سا وہ سوال ہے کہ جو رشکِ زلفِ دوتا نہیں ؟
یہ جو کشمکش سی ہے درمیاں یہ بھی فرقتوں سے جدا نہیں

یہ جو لغزشوں کے ہیں سلسلے انھیں انتصار میں ڈھال کر
کسی ایک روزِ حساب کو کبھی رشکِ صبحِ وصال کر
***

افسانے

کمار سانو۔۔۔ انور جمال انور

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کمار سانو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے دل کی حقیقی ترجمانی کوئی کر سکتا تھا تو وہ یہی فنکار تھا۔ اس نے نیا ریکارڈ پلیئر خرید لیا جس کا ساؤنڈ اتنا زیادہ تھا کہ چوتھے محلے کی صائمہ تک بھی پہنچ جاتا، مگر فی الحال اسے اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک منزلہ عمارت میں اس کا کمرا چھت پر واقع تھا جہاں سے وہ جب بھی نیچے جھانکتا، نگاہوں کی مراد بر آتی۔ اس کی بھابھی جسے وہ، بھرجائی کہتا تھا بڑے سے آنگن میں جھاڑو لگاتی یا برتن دھوتی یا بکریوں کو چارہ دیتی نظر آجاتی اور اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ وہ ریکارڈ پلیئر آن کرتا تو اس کا ترجمان کمار سانو اپنی مدھر آواز میں گانے لگتا؛

نظر کے سامنے جگر کے پاس

کوئی رہتا ہے، وہ ہو تم تم تم

اور جب جواب میں الکا یا سادھنا گاتی تو اسے لگتا یہ کوئی اور نہیں بھرجائی کے اپنے بول ہیں اور وہ بھی اسے اتنا ہی چاہتی ہے۔ حالانکہ یہ بات ابھی ثابت نہیں ہوئی تھی کہ وہ سچ میں اسے کوئی اہمیت دیتی ہے یا نہیں مگر اتنا ضرور تھا کہ کمار سانو کی پکار پر اس کا ڈوپٹہ ڈھلک ڈھلک جاتا اور برتن دھوتے دھوتے یا جھاڑو لگاتے لگاتے اس کے سینے کے ابھار کھل کر سامنے آجاتے۔ وہ چھت کی بلندی سے جب نیچے دیکھتا تو اکثر کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹ جاتا اور اف اف کی آوازیں نکالنے لگتا،۔

یہ بھرجائی تو روز بہ روز نکھرتی جا رہی ہے، وہ سوچتا۔ حالانکہ وہ پکے رنگ کی تھی۔

جب بھائی اس کی ڈولی لے کر آیا تھا تب بھی وہ اسے کوئی خاص پسند نہیں آئی تھی اور شادی سے پہلے تک تو وہ اسے بالکل ہی بیکار لگتی تھی۔ پتہ نہیں ایک سال کے اندر اندر کیا ہوا تھا کہ اس نے خاص اداؤں کے ساتھ ساتھ اپنی جلد کو بھی تبدیل کر لیا تھا۔

سوال ''کیا سانپ کی طرح کچھ خواتین بھی اپنی کینچلی تبدیل کر سکتی ہیں؟'' جواب ''پتہ نہیں۔''

بھرجائی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر جب باہر گلی میں محلے کی عورتوں کے بیچ بیٹھتی تو کہتی

''بہن، رب کسے نوں حسن نہ دیوے، سارے مرد پچھے پے جاندے نے۔ (بہن خدا کسی کو حسن نہ دے ورنہ سارے مرد پیچھے لگ جاتے ہیں)

کوئی حیران ہو کر پوچھتی

''ہائے بہنا کون تیرے پیچھے پڑا ہے تو بھرجائی فوراً اللہ توبہ کرتی

''ہائے ہائے میرے پچھے کون آوے گا میں اس دا منہ نہ توڑ دیاں۔

یہ نائنٹی سے ذرا پہلے کا دور تھا چنانچہ فراغت ہی فراغت تھی۔ دن کاٹے نہیں کٹتا تھا، صبح ہوتی تو دوپہر نہ ہوتی، کسی طرح دوپہر ہو جاتی تو شام نہ آ کر دیتی۔ شام کو گلی میں ایک طرف عورتوں تو دوسری طرف محلے کے بڑے بوڑھوں کی بیٹھک لگتی۔ ایک ایک چارپائی پر چار چار بزرگ بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے، کھانستے اور نئی نسل کی بے راہ روی کا رونا روتے۔ انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کا موضوع سخن کچھ اور ہونے والا ہے۔ کلر ٹی وی مارکیٹوں میں آ چکا تھا۔ اب وی سی آر کی وبا پھیلنے والی تھی۔ عورت کی شرم و حیا پر باتیں کرنے والے یہی بزرگ کل کو چھپتے چھپاتے جب وی سی آر کرائے پر لائیں گے تو ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ جائیں گی اور اگلے دن حقہ گڑگڑاتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر کہیں گے

'' اللہ معاف کرے، اے انگریز تے بڑے ہی بے غیرت نے''۔

پھر وہ دیر تک انگریز کی گندی حرکتوں کا ذکر کیا کریں گے جو انہیں نیلی فلموں میں دیکھنے کو ملیں گی۔ اور جب وہ نظر اٹھا کر گلی کے دوسرے سرے پر خوش گپیاں کرتی مٹیاروں کو دیکھیں گے تو سوچیں گے یہ تو بڑی ہی پاک دامن بیبیاں ہیں، انہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔

بھرجائی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا ایک عاشق ہے اور وہ اس عاشق کو اتنا تڑپانے والی ہے، اتنا تڑپانے والی ہے کہ وہ اس کے آگے ناک رگڑ دے گا اور دونوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگے گا۔ کس بات پر معافیاں مانگے گا، یہ بھی اسے معلوم تھا۔ اسے تڑپانے کے لیے ہی وہ ہر وقت ہونٹوں پر سرخی لگائے رکھتی اور بڑے بڑے گلے والی قمیضیں پہنتی۔ اس کے ہونٹوں پر سرخی جچتی بھی بہت تھی۔ پیارے پیارے مکھڑے پر جیسے کسی نے گلاب کی دو سرخ پتیاں سجا دی ہوں۔ کمار سانو کا نیا آنے والا گیت بھی ان دو پتیوں کے بارے ہی تھا۔ یعنی

چوم لوں ہونٹ ترے دل کی یہی خواہش ہے

بات یہ میری نہیں پیار کی فرمائش ہے

جب اس گانے کی کیسٹ وہ خرید کر لایا تو اس نے تو اسے بجا بجا کر حد ہی کر دی اور بھرجائی کے سن سن کر کان پک گئے اور تنگ آ کر وہ چھت کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر کہنے لگی

''لے بھائی تو آ کر چوم لے میرے ہونٹ اور جان چھوڑ''۔

اس کے بعد مارکیٹ میں ایک اور کیسٹ آ گئی۔ کمار سانو چھا گیا تھا، نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔ اس نے ان کہے جذبات کو الفاظ دے دیے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں جو کچھ ایک دوسرے کو کہنا چاہتے تھے وہ کمار سانو کی زبان سے کہہ ڈالتے۔ اسی گلوکار کی وجہ سے بھرجائی بھی مجبور ہو چکی تھی اور ایک دن جب وہ چھت والا اوپر سے اتر کر نیچے آیا اور زبردستی اس کے ہونٹ چوم کر بھاگ گیا تو وہ کچھ بھی نہ کر پائی، دیر تک ساکت ہو کر ایک مخملی کیفیت میں مبتلا رہی۔ نگاہوں سے محبت کرنے والے نے آج اسے آ کر چھو لیا تھا۔ ''اف اللہ'' کیفیت ختم ہوتے ہی اسے خوف نے آ لیا، یہ میں کیا ظلم کرا بیٹھی ہوں اپنے ساتھ۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگی۔ منڈیر پر بیٹھا کالا کوا زور زور سے کائیں کائیں کرنے لگا۔ وہ سہم گئی کہ کہیں یہ کوا ہی نہ سب کو بتا دے۔ اس نے ہش، ہش، کر کے کوے کو اڑانے کی کوشش کی مگر وہ ڈٹا رہا اور پورے جسم کا زور لگا کر کائیں کائیں کرتا رہا جیسے اسے ڈانٹ رہا ہو۔ وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر کے بستر پر گر گئی۔ رات کو وہ نیند میں تھی جب اس کے شوہر نے اسے چوما، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بدن اس خوف سے لرز گیا تھا کہ کہیں یہ دیور نہ ہو۔ بچت ہو گئی کہ یہ وہ نہیں تھا بلکہ وہ تھا جس کا سچ مچ حق بنتا تھا۔ منہ ایک اور چومنے والے دو۔

سوال ''کیا یہ سلسلہ چلنا چاہئیے؟''

جواب ''نہیں۔''

وہ یہ سوچ کر دوبارہ سو گئی کہ صبح کسی ایک کو وہ ضرور سختی سے منع کر دے گی۔ صبح دونوں بھائی اٹھ کر کام پر چلے گئے۔ اسے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جبکہ مردود کوا صبح ہی صبح آن دھمکا، کائیں کائیں کائیں۔ وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ کچر کچر باتیں کرنے والی محلے والیوں میں جا بیٹھی۔ تمام عورتیں جمیلہ کو اپنے جھرمٹ میں لیے اسے دلاسے تسلیاں دے رہی تھیں۔ جبکہ جمیلہ محض سر کو جھکائے ہوئے ناک کو سڑ سڑ کر رہی تھی۔ آج اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور طلاق کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی۔ قصور بیچاری کا صرف اتنا تھا کہ وہ سامنے والوں کے منڈے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی پکڑی گئی تھی۔

اے مردذات تے بہت ہی شکی ہوندی اے۔ عورتیں مردذات کی اس عادت پر بہت ہی نالاں نظر آئیں اور دیر تک لعنت ملامت کرتی رہیں۔

بھرجائی کا اپنا بھی ماتھا ٹھنکا تھا۔ جمیلہ کی یہ حالت دیکھ کر اسے اپنی بھی فکر پڑ گئی تھی۔ اس نے سبق سیکھا کہ کسی غیر کے آگے کبھی بھی ہنس ہنس کر باتیں نہیں کرنی۔۔ اس نے سوچا، غیر تو غیر اب وہ اپنے دیور کے سامنے بھی کبھی نہیں ہنسے گی۔ بھرجائی وہاں بیٹھی دیر تک خیالوں میں کھوئی رہی۔ بظاہر وہ محلے والیوں کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی مگر اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ گلی میں بیٹھا ایک کتا زور سے بھونکا تو اسے ہوش آیا۔ کتا ایک بلی کے پیچھے بھاگا تھا۔ بلی اس طرف دوڑ گئی جس طرف بڑے بوڑھے اپنی بیٹھک جمائے ہوئے تھے۔ وہ اٹھی اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

شام کو جب دیور گھر آیا اور آتے ہی اس نے کمار سانو کو بجانا شروع کیا تو وہ غصے سے پاؤں پٹختی چھت پر جا پہنچی۔

یہ دعا ہے میری رب سے تجھے

عاشقوں میں سب سے میری عاشقی پسند آئے۔

میری عاشقی پسند آئے

کمار سانو کہہ رہا تھا مگر بھرجائی نے جاتے ہی ڈیک کا تار کھینچ دیا ''۔۔۔ وے تینوں شرم نئیں آندی۔۔۔''

وہ پنجابی زبان میں صلواتیں سنانے لگی جس کا متن یہ تھا کہ یہ تم کیا بجاتے رہتے ہو فضول میں۔ اور یہ کیا حرکت کی تھی کل تم نے۔ اگر تمہارے بھائی کو پتہ لگ گیا تو کیا ہوگا کبھی سوچا ہے۔ اور جب میرا رشتہ لے کر میرے گھر والے آئے تھے تو اس وقت تم نے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت تمہیں میں اچھی نہیں لگتی تھی۔ اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھتے تھے تم۔ اب تمہارے بھائی سے میرا بیاہ ہو گیا ہے تو مر رہے ہو۔ اب کیا فائدہ۔

پتہ نہیں بھرجائی ڈانٹ رہی تھی یا اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ یہ تو سچ ہی تھا کہ اس کا رشتہ آیا تھا مگر انکار کے بعد وہی رشتہ دوسرے بھائی کے ساتھ طے ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے ٹھکرا دی گئی تھی۔ اور یہ ٹھکرایا جانا وہ کبھی فراموش نہیں کر پائی تھی۔ اسے انتقام لینا تھا ایک ایسا انتقام جو مسلسل جاری رہے۔ اس کے لبوں کی لالی اس کی نکھری ہوئی جلد اور بے ڈوپٹہ سینے کے دونوں ادھ کھلے ابھار ہی دراصل اس کے انوکھے انتقام کی ایک شکل تھی۔ وہ پنجابی میں خوب ڈانٹ پلانے کے بعد نیچے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور پتہ نہیں کس وجہ سے رونے لگی۔

سوال "کیا عورت کبھی سمجھ میں آ سکتی ہے؟

جواب "نہیں"

کمار سانو کا منہ بند ہو چکا تھا۔ اور دیور جی نے نہ رات کا کھانا کھایا نہ صبح کا۔ منہ اندھیرے ہی کہیں نکل گیا۔ بھرجائی کو فکر ستانے لگی۔ سوچا کاش اسے اس طرح ذلیل نہ کرتی۔ جب وہ دوپہر کو گھر آیا تو پوچھا کام پر کیوں نہیں گئے اور ناشتہ بھی نہیں کیا؟

وہ کچھ نہ بولا، چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ بھرجائی کے دل پر کوڑے پڑ گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ رات بھر روتا رہا ہے۔ وہ بے چین ہو گئی، پریشان ہو گئی، چکی کے دو پاٹوں میں آ گئی۔ رشتوں کے تقاضے اپنی جگہ مگر اسے یہ بھی کب منظور تھا کہ کوئی اس کی وجہ سے کھانا پینا چھوڑ دے اور رو رو کر آنکھیں سجا لے۔ اس نے کھانا گرم کر کے اسے کھانے کو دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا، گردن لٹکائے ہونٹ کاٹتا رہا۔

'چل کھانا کھا لے۔۔ چھوڑ پرے۔۔۔"، وہ نرمی سے کہنے لگی۔ وہ نہ مانا۔ "اچھا چل کھانا تو کھا"، وہ زور دے کر کہنے لگی۔

''میں نہیں کھاؤں گا''۔ آخر کار ایک پتلی سی آواز بر آمد ہوئی۔

''کیوں نہیں کھائے گا؟ مرنا ہے تجھے؟''

وہ منہ گھما کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا ادھر تو دیکھ''۔ وہ لاڈ سے کہنے لگی۔

''مجھے نہیں دیکھنا''۔

''دیکھ تو سہی''۔ وہ یوں دیکھنے کو کہہ رہی تھی جیسے ابھی آنکھوں ہی آنکھوں سے سارے معاملات درست کر لے گی۔

''اچھا غلطی بھی تیری اور ناراض بھی تو ہو رہا ہے۔ چل میں تجھ سے معافی مانگ لیتی ہوں''۔ بھرجائی نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ دیور جی کے ضبط کیے ہوئے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ بے اختیار رو پڑا۔

بھرجائی کے دل پر ایک اور کوڑے کی ضرب لگی اور وہ ایکدم سے بھول گئی کہ اس کا شوہر کون ہے اور یہ اس کے سامنے کون ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ منڈیر پر چغل خور کوا کائیں کائیں ہی کرتا رہ گیا۔ اس کی ایک نہ چلی اور دور کھیتوں میں کسان نے نئے بیج بو دیئے اور باغوں میں اتنے پھول کھلے کہ مالی مالا مال ہو گیا۔ گلی کا کتا بلی کے پیچھے دوڑتا تو وہ بھاگ کر بابوں کی چارپائی کے نیچے چلی جاتی اور دور سے اسے منہ چڑاتی۔ محلے والیاں جمیلہ کا دکھ بانٹتیں اور بھرجائی کہیں اور ہی خیالوں میں کھوئی رہتی۔ یا کبھی کبھی کہتی

''نی بھینا مرد جدوں پیار وچ انھا ہو جائے تے فیر کج نئیں ہو سکدا۔ (اے بہن مرد جب پیار میں اندھا ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا)

کمار سانو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اب وہ روز شام کو اپنے سر بکھیرتا اور اس کا منہ پھیرنے کی بجائے آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتی۔ دونوں مل کر گنگناتے، پیار کے گیت گاتے۔ ایکدوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے۔ پھر وہی ہاتھ بانہوں میں تبدیل ہو کر ایک دوسرے کو کھینچ لیتے۔ پھر دو پیاسے ہونٹ آگے بڑھتے اور ایک دوسرے کو اتنا چومتے اتنا چومتے کہ چہرہ لال کر دیتے یہاں تک کہ کالا کوا چیخ چیخ کر اپنا گلا سکھا لیتا اور بھرجائی ہنس کر کہتی

''تو جل جل کے اور کالا ہو جا کوے ۔ خوشی کے دن تھوڑے ۔ ۔ ۔''

یہ کائیں کائیں ایک دن ابا جی کے کانوں تک پہنچ گئی ۔ انہوں نے بہو کو بلایا ۔ حکم دیا کہ فوراً اپنے دیور کے لیے کڑی تلاش کر ۔ کب تک وہ کنوارا رہے گا ۔ اس کا بھی بیاہ کر دیتے ہیں تاکہ میں فارغ ہو جاؤں ۔ ابا جی نے دو چار گھروں تک بھی رہنمائی کی کہ وہاں جا کے پتہ کر اور رشتے کی بات چلا بھرجائی جانتی تھی کہ یہ دن ایک دن آنے والا ہے ۔ مگر اتنی جلدی کیوں ۔ ۔ ۔ دو چار سال اور نکل جاتے ۔ اسے اتنا دیوانہ بنا دیتی کہ پھر وہ شادی کے قابل ہی نہ رہتا ۔ ملنگ بن جاتا یا کسی مزار کا بابا یا مجنوں بن کر جنگل جنگل گھومتا ۔ جس نے اسے بوجہ غرور ٹھکرایا تھا اس کی ایسی سزا تو بنتی تھی ۔ پہلا ہی رشتہ اتنا اچھا تھا کہ اس نے سر توڑ کوشش کر کے منع کروا دیا ۔ لڑکی حد سے زیادہ خوبصورت تھی ۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو وہ اگر دیورانی بنا کر لے آتی تو اس کی اپنی کیا ویلیو رہ جاتی ۔ اسے تو ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اس سے کمتر ہو ہر معاملے میں ۔ ابا جی نے رشتہ ڈھونڈنے کا کام اسے سونپا ہوا تھا چنانچہ وہ اپنے مطلب کی دیورانی تلاش کرنے میں ضرورت سے زیادہ ہی کامیاب ہو گئی ۔ یہ ایک بے کشش اور بڑی عمر کی کوئی عورت ٹائپ کنواری تھی ۔

کمار سانو کا چہیتا گھوڑی چڑھ گیا اور اپنی خود کی دلہن لے آیا ۔ بھرجائی بیاہ والے دن رونے دھونے کی بجائے مطمئن اور مسرور تھی ۔ یقین رکھتی تھی کہ سہاگ رات کے بعد جو سورج طلوع ہو گا ۔ وہ سب کچھ واپس بحال کر دے گا ۔ پھر وہی کمار سانو کی آواز ہو گی اور وہی اس کا عاشق اس کے لیے جان قربان کرنے کو حاضر ہو جائے گا ۔ مگر یہ کیا ۔ ۔ ۔ ایک دن گزرا ۔ دوسرا دن گزرا ۔ ۔ تیسرا دن بھی چلا گیا مگر عاشق تو ایک منٹ کے لیے بھی اپنا کمرا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا ۔ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ نصیب دشمناں کہیں طبیعت تو خراب نہیں ۔ مگر پتہ چلا کہ بندہ ہشاش بشاش ہے ۔ اسے اپنا کمرا بے حد پسند آ گیا ہے ۔ کون بھرجائی، کس کی بھرجائی ۔ ، کیسی بھرجائی ؟ جب کعبے کا رخ ہی تبدیل ہو گیا، تو سجدوں کا رخ بھی کیوں نہ بدلے ۔

وہ سب کچھ بھول چکا تھا ۔ یہاں تک کہ اس نے مڑ کر کمار سانو کی بھی خبر نہ لی ۔ الکا حیران تھی کہ کوئی یوں بھی بدل سکتا ہے کیا آن کی آن میں ؟

سوال ''کیا کوئی یوں بھی بدل سکتا ہے ؟

جواب ''ہاں''

کالا کوا اب کائیں کائیں کی بجائے زور زور سے ہنستا۔ اور بھرجائی کا جی بھر کے مذاق اڑاتا۔ ہتک محسوس کر کے وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتی۔ مہینوں انتظار کے باوجود عاشق اپنے پرانے موڈ میں واپس نہ آیا۔ اس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک سوکھ سوکھ کر مٹی ہو گئی۔ بڑے گلے کی قمیضیں سکڑ کے چھوٹی ہو گئیں اور سینے کے ابھار دب کر کہیں سینے میں ہی گم ہو گئے۔ ۔ ایک دن گلی میں ریڑھی والا آیا اور پانچ روپے کلو کے حساب سے ساری کیسٹیں خرید کر لے گیا۔ کچھ کچھ باتیں گھماتی محلے والیاں اب بھرجائی کے معاملے کو لے بیٹھی تھیں، ۔ نجانے انہیں کس نے خبر دے ڈالی تھی کہ وہ اپنے دیور پر مرتی ہے۔ عورتیں دبی زبان میں اسے دلاسے دیتیں مگر وہ اپنے ہی خیالات میں کھوئی رہتی یا کبھی کبھی کہتی؛

''نی بھینا مرد صرف جسم دا بھکا ہوندا ای۔'' (اے بہن مرد صرف جسم کا بھوکا ہوتا ہے۔)

***

بدلہ ۔۔۔ عبد الرحمٰن

کرکراتی اور چلچلاتی دھوپ میں جمعہ کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے باہر نکلا تو چند قدم طے کرنے کے بعد ہی ایک معمر صاحب ایک ہاتھ میں تربوز اور دوسرے ہاتھ میں خربوزے کا بڑا سا تھیلا اٹھائے جھومتے نظر آئے ۔ گرمی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنا پھل انہوں نے خرید تو لیا تھا لیکن اچھی صحت ہونے کے باوجود انہیں اسے گھر لے جانا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ کبھی سیدھی طرف تو کبھی الٹی طرف لڑکھڑا رہے تھے ۔ مجھ سے یہ دیکھا نہ گیا اور آناً فاناً ان کے نزدیک پہنچ کر تھیلا ہاتھ میں لیتے ہوئے ان سے کہا۔ ''لائیے حضرت سامان مجھے دے دیجیے ۔ میں گھر تک چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔ ''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ۔ ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے تھیلے میری جانب بڑھا دئے اور لگے مجھے دعائیں دینے ۔ میں نے ان صاحب کے چہرے پر غور کیا تو پتہ چلا ان کے چہرے سے پسینہ ایسے ٹپک رہا تھا جیسے ٹھنڈی بوتل کو فریج سے نکالنے کے بعد اس کے بخارات بہہ رہے ہوتے ہیں ۔ مزید یہ کہ وہ ابھی بھی مسلسل چکرا رہے تھے ۔

چوں کہ اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو میرا تعارف لینا حضرت صاحب کے لیے ناگزیر تھا۔ تاہم اپنا انٹرویو دیتے ہوئے مجھے پتہ ہی نہ چلا میں کب ان کے ساتھ ان کے گھر کے بالکل باہر کھڑا تھا۔ گھر عالی شان تھا اور دور سے ہی آنے والے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے ہی میں نے اجازت چاہی تو مشفق بزرگ نے سختی سے انکار کیا اور بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ اندر لے آئے ۔ وہ مجھے گھر والوں سے ملوائے بغیر اور خاطر تواضع کیے بنا رخصت کرنے کے حق میں نہیں تھے ۔

شرماتا گھبراتا میں ان کے ساتھ اندر چلا آیا۔ گھر کا دروازہ بیچوں بیچ تھا۔ جس کو تین سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر عبور کرنا پڑتا تھا۔ دائیں طرف بڑا سا باغ جو ہری بھری گھاس اور کیاریوں کے رنگا رنگ پودوں سے سجا ہوا تھا۔ اور دروازے کے بائیں طرف پکا فرش تھا جہاں سفید رنگ کی ایک لمبی گاڑی اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

گھر کے اندر داخل ہونے کے بعد وہ مجھے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بٹھا کر کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوئے اور واپس آ کر باتوں کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ان کی زوجہ محترمہ تشریف لائیں اور پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے لال شربت کا گلاس تھما دیا۔ چوں کہ لال شربت اپنی حد سے بڑھی ہوئی مٹھاس کے باعث مجھے کبھی پسند نہ آیا تھا اس لیے میں نے تکلفاً اسے قریب ہی دھری میز پر رکھ دیا اور ذہن میں کسی طرح اس سے پیچھا چھڑانے کے منصوبے بنانے لگا۔

باتوں باتوں میں میری پڑھائی اور دیگر سرگرمیوں کی بھی بات چلی جس پر میں نے بڑے پرسوز اطمینان سے یہ انکشاف کر دیا کہ میٹرک میں بھی خدا خدا کر کے ریاضی میں ''جسٹ پاس'' ہوئے تھے لیکن کالج میں تو پاسنگ مارکس کی بھی کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ البتہ باقی مضامین میں کارکردگی قابل اطمینان نہیں تو قابل احتساب بھی نہیں۔ گویا دبے لفظوں میں اپنی نالائقی کا اعتراف کر دیا تھا۔

''بیٹا کوئی اچھی ٹیوشن کیوں نہیں لیتے؟'' دونوں مہربانوں کو میری دل سے فکر ہو رہی تھی۔ ''معلمی آج کل صرف ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے۔ طالب علم کے جذبات کو سمجھنا، اس کی مشکلات کا ادراک کرنا، اس کی ذہنی سطح پر اتر کر دوستوں کی طرح اسے سبق پڑھانا، اس کے ساتھ دل لگانا یہ سب آج کل کے ٹیوشنوں اور سینٹروں میں مفقود ہے۔ ایسے حالات میں پڑھنے والے پڑھ لیتے ہیں لیکن ہم بالکل نہیں پڑھ پاتے۔ اس لیے اپنی مدد آپ کے تحت جتنا ہم خود پڑھ سکتے ہیں ضرور پڑھتے ہیں۔'' میری یہ دانش مندانہ گفتگو سن کر دونوں بالکل خاموش ہو گئے لیکن دل ہی دل میں میرے معترف بھی ہو گئے۔

ابھی مجھے خاموش ہوئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے جب ڈرائنگ روم میں ایک کسرتی بدن کا لمبا تڑنگا لڑکا داخل ہوا جس کی شرٹ کے اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بال اتنے لمبے تھے کہ چاہتا تو آرام سے پونی بنا سکتا تھا۔ کلین شیو مگر مونچھیں نمایاں تھیں جس کو دونوں جانب سے تاؤ دینے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔ گویا غنڈہ گردی کے جوگر

وہ اپنے اندر پیدا کر سکتا تھا کر رکھے تھے۔ آتے ہی دیوار کے ساتھ لگے کی ہولڈر سے ایک چابی اٹھائی جو مجھے موٹر سائیکل کی لگی۔ اور ساتھ ساتھ مجھ پر بھی کھا جانے والی نظریں جما دیں۔

''یہ کون ہے؟'' درشتی سے اس نے بزرگ سے سوال کیا؟ کہاں جا رہے ہو تم؟ اسی درشتی سے بزرگ نے جوابی سوال کیا۔ جس کا اس نے لاپروائی سے یک سطری جواب دیا کہ دوستوں میں جا رہا ہوں اور باہر نکل گیا۔ بزرگ کے سوال سے اس کا دھیان میری طرف سے ہٹ گیا تھا۔ بزرگ کو شاید معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے تاہم پوچھنا پھر بھی ضروری سمجھا۔

''یہ میرا بیٹا ہے۔'' اس کے باہر جانے کے بعد پہلا جملہ میں نے بزرگ سے یہ سنا۔ بات کو آگے ان کی اہلیہ نے بڑھایا۔ بہت لا پرواہ اور آوارہ ہو گیا ہے۔ بہت ہوشیار ہے مگر اپنی ہوشیاری کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر رہا ہے۔ اس لڑکے کے ماں باپ کی پریشانی دیکھ کر میرے چہرے سے بھی فکر مندی ظاہر ہونے لگی۔

ابھی مشکل سے ہی کچھ پل اور گزرے ہوں گے کہ خزاں کے موسم کی مانند سوگوار ماحول میں یکایک بہار کی ٹھنڈی ٹھنڈی دلکش ہواؤں نے انگڑائی لی۔

پہلے ہی لمحے میں اس کی جلوہ گری میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں اس سے پہلے حسن سے آشنا نہیں تھا۔ لیکن کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو رعنائی اور زیبائی کو ایک نئی تعریف دے جاتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ان لاکھوں چہروں میں سے ایک تھا۔

اس عشوہ طراز نے جامنی رنگ کا لمبا فراک زیب تن کر رکھا تھا، سینے پر دھری لمبے سیاہ بالوں کی کس کر بنائی گئی چٹیا کالے ناگ کی طرح کسی قیمتی خزانے کی حفاظت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نیچے سفید چوری دار پاجامہ اس کے جامنی فراک کے ساتھ بہت جچ رہا تھا۔ گھنی پلکیں اور اس پر قدرتی گہرا کاجل، اس کی آنکھوں میں عجب سا سحر طاری کر رہا تھا۔ وہ سر تا پا ادا ہی ادا تھی جس پر میں فدا ہی فدا ہو رہا تھا۔

کبھی پہلو بدل کر اور کبھی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر میں اپنی بے چینی کو قابو میں لانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ بزرگ پھر گویا ہوئے یہ میری بیٹی ہے۔ اس بار ان کے چہرے پر تبسم تھا۔ جو اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ انہیں اپنی بیٹی کس قدر عزیز ہے۔ میں جو اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا بزرگ کے گویا ہونے سے یک دم سنبھل گیا اور اپنے اندر کے امڈتے سیلاب کے آگے بند باندھتا ہوا پھر سے پرانی سنجیدگی میں آ گیا۔

''مجھے اب اجازت دیجیے۔ ''میں نے اب نکلنے میں ہی عافیت جانی۔ ''آپ نے شربت تو پیا ہی نہیں۔ ''میں چونکا۔ شربت کی طرف توجہ دلانے والے ماں باپ نہیں بلکہ اُن کی لاڈلی صاحبزادی تھی۔ میں ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھ کر شرم سے پھر نظریں چرا گیا۔ کچھ کہے بنا میں نے گلاس اٹھا لیا اور بڑے بڑے گھونٹ لیتا ہوا شربت پی لیا۔ اس کی زبان سے نکلنے والا جملہ اس قدر میٹھا تھا کہ لال شربت کی چاشنی بھی مجھے پھیکی پھیکی سی لگی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ میرے لیے ناگوار ہو گیا۔ لیکن اس وقت میری یہ حالت تھی کہ اگر وہ مجھے زہر بھی پینے کو دیتی تو میں اسی طرح چپ چاپ پی لیتا۔

میری بیٹی نے بی کام کیا ہے۔ میتھس میں بہت اچھی ہے۔ تم کل سے پڑھنے آ جاؤ میتھس کے ساتھ ساتھ باقی سبجیکٹس بھی پڑھا دے گی۔ میری حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

مجھے لگ رہا تھا میں ایک لفظ بھی بولوں گا تو ہمیشہ کے لیے قوت گویائی سے محروم ہو جاؤں گا۔ بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکا کہ کیا فیس لیں گی آپ؟ اس پر وہ سب ہنس پڑے۔ وہ بھی دھیمے سے مسکائی۔ اور اس کی مدھر سی مسکان نے میرے رہے سہے حواس بھی معطل کر دیے۔

اگلے دن سے ہی میں اُس ماہ پارہ کے گھر ٹیوشن پڑھنے کے لیے پہنچ گیا۔ سب سے دعا سلام کر لینے کے بعد وہ مجھے سیدھا اپنے کمرے میں لے گئی اور میری پچھلی کارکردگی کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کے بعد مجھے ابتدا سے پڑھانا شروع کر دیا۔ آج اُس کے بال مکمل کھلے تھے۔ اُس کی اڑتی زلفوں پر ایک ایسا مسحور کن اندھیرا تھا جس کے آگے ہزاروں روشن سویرے خوشی خوشی قربان تھے۔ اُس کے دلنشین انداز بیان کی وجہ سے میں اُس کے سامنے گوں گا ہو کر بیٹھا رہتا تھا اور ہر سوال کی تفہیم پر سر ہلاتا رہتا تھا۔ سلام دعا کے علاوہ اُس نے میری آواز کبھی نہ سنی تھی۔ میں اُس سے ریاضی کے متعلق کوئی سوال نہ کرتا تھا۔ بس پلکیں جھپکائے بغیر اُس کو دیکھتا ہوا سنتا رہتا تھا۔ لیکن ایک بات جس پر میں سراپا تعجب تھا وہ یہ کہ مجھے اب ریاضی میں مزہ آنے لگا تھا۔ ایک دم سے جیسے کوئی معجزہ ہوا تھا جس نے میرے کند ذہن میں روشنیاں بھر دی تھیں۔ مشق میں دیے جانے والے سوال جب میں اُسے حل کر کے دکھاتا تھا تب وہ بہت خوش ہوتی تھی۔

آخر کار میری طرف سے جب خاموشی کا روزہ نہ توڑا گیا تب ایک بار زچ ہو کر وہ خود ہی بول پڑی۔ ''یہ تم مجھے اس طرح سے کیوں دیکھتے رہتے ہو؟ کیا میری صورت بہت اچھی ہے؟ تمہیں پتہ نہیں ہم دونوں کی عمر میں کتنا فرق ہے؟''

''جی۔۔۔۔۔؟'' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس کے اندر چلا جاؤں۔ ''نہیں۔۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔۔۔ معافی چاہتا ہوں کل سے پڑھنے نہیں آؤں گا۔''

''تم پاگل ہو؟ میں نے تمھیں جانے کا کہا ہے؟ ایک سوال پوچھا ہے اس کا سیدھا سیدھا جواب نہیں دے سکتے تم؟''

میری جان میں کچھ جان آئی اور رکا ہوا سانس تھوڑا بحال ہوا۔ میں نے آخری سوال تو نظر انداز کر دیا۔ لیکن پہلے دو سوالوں پر میری توجہ کچھ زیادہ ہی مرکوز ہو گئی۔ بہت اچھی صورت؟ میں نے حیرانگی سے کہا۔ ''اگر خدا کو جنت کی حوروں کا نمونہ دنیا والوں کو دکھانا ہو تو وہ مثال کے طور پر یقیناً آپ کو ہی پیش کرے گا۔''

میرا یہ برجستہ تبصرہ سن کر وہ بدک گئی اور شرم سے لال ہو گئی۔ سرخی و سفیدی کا یہ امتزاج اُس پر بہت جچ رہا تھا۔

چلو آج بہت پڑھ لیا۔ تم ویسے خود کو نالائق کہتے ہو لیکن ہو بڑے لائق۔ خیر آج ہم باتیں کرتے ہیں۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟ ''جی نہیں، اعتراض کیسا؟'' میں نے بمشکل خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے جواب دیا۔ میرا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی باہر نکل آئے گا۔ میری یہ مشکل بھی اسی نے آسان کی اور بے تکلف ہو کر بولتی چلی گئی۔

اُس دن پتہ چلا وہ بولتی بہت تھی۔ لیکن میرے کانوں میں تو رس ہی گھولتی تھی۔ اُس کی باتیں کوئی گہری فلسفیانہ مظاہر کی علامت نہیں ہوتی تھی مگر مجھے پھر بھی بہت لطف آتا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے سنگھار میز سے اپنی تین ہری چوڑیاں میرے آگے لہرائیں اور اُنہیں پہنتے ہوئے کہنے لگی: ''جانتے ہو یہ میری پسندیدہ چوڑیاں ہیں۔ لیکن ٹوٹ ٹوٹ کر بس تین ہی بچی ہیں۔ لیکن مجھے یہ تین بھی اتنی پسند ہیں کہ انہیں بھی خوشی خوشی پہنتی ہوں۔''

اُسے چوڑیاں پسند ہیں؟ میں نے خود سے یقین دہانی والے لہجے میں سوال کیا۔ میں من ہی من کچھ طے کر چکا تھا۔ جب وہاں سے خوب سیر ہو کر باہر نکلا تو سیدھا چاچا کرمو کی دکان میں گھس گیا۔ چاچا کرمو کی آرٹی فیشل جیولری کی بڑی دکان تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ چاچا چیزیں تو آرٹی فیشل بیچتے تھے۔ لیکن ان کے اخلاق بالکل آرٹی فیشل نہیں

تھے۔ گاہک ہو یا کوئی عام سوالی سب سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ رعایتی قیمتوں پر سودا کرنے کے قائل تھے۔ لالچ اور حرص سے کوسوں دور تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔

- -

''السلام علیکم چاچا!''

''وعلیکم السلام ببوے! آج ادھر کیسے؟''

''وہ چاچا ایک چھوٹا سا کام ہے آپ سے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں شہزادے کام ہے تبھی تو چاچے کے پاس آیا ہے ورنہ تو یہاں تُو پھٹکتا بھی نہیں۔ اچھا بول کیا چاہیے؟''

چاچا نے سیدھا سوال کر ڈالا تو میں بھی سیدھا بول پڑا۔

''وہ ہری والی چوڑیاں۔''

میں نے شوکیس کے ایک طرف اشارہ کیا تو چاچا نے پہلے حیرانی سے چوڑیوں کو پھر مجھے دیکھا۔ ''تجھے چوڑیاں پہننے کا کب سے شوق ہو گیا پگلے؟ یہ کنیاؤں کے کام ہوتے ہیں۔''

''مجھے اپنے لیے نہیں چاہیے چاچا لیکن مجھے چاہیے۔''

مجھے چاچا کا جواب معلوم تھا اس لیے میں نے جواب پہلے سے ہی تیار کر رکھا تھا۔ ''کس کے لیے؟'' چاچا نے بھنویں اچکا کر حیرانی سے پوچھا۔ جواب میں میری مسکراہٹ پر جہاں دیدہ چاچا بھی اس طرح مسکرا دیے جیسے پورا معاملہ سمجھ گئے ہوں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چاچا پورا معاملہ سمجھ گئے تھے۔

''تو لے جا۔ منع کیا ہے کبھی تجھے۔''

''نہیں ایسے نہیں۔ محنت مزدوری کر کے۔ ورنہ نہیں۔''

مفت کا مال محبوبہ کے قدموں میں ڈال دینا میری غیرت کے خلاف تھا۔ خون پسینے سے پیش کی گئی چیز کا کیا مول ہوتا ہے یہ سمجھایا نہیں جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

چاچا میری عادات سے واقف تھے۔ اس لیے کچھ نہیں بولے سوائے اس کے کہ اچھا جو کرنا ہے کر۔

چاچا نے میرا جتنا دھیان رکھنے کی کوشش کی میں نے اتنا ہی کام کا بوجھ اپنے اوپر لے کر چوڑیاں حلال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

چاچا بکریوں کے بہت شوقین تھے۔ بقرہ عید میں تو الگ مگریوں بھی سال بھر بکریاں پالا کرتے تھے اور اپنی دکان کے باہر ہی باندھ دیا کرتے تھے۔ لیکن اس طرح کہ آنے جانے والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

صورت حال میرے حق میں کچھ اس طرح ہو گئی تھی کہ چاچا کا واحد ملازم بیماری کی وجہ سے دو دن کی چھٹی پر تھا۔ میں شام کے اوقات میں بکریاں ٹہلانے لے جاتا۔ ان کے گھاس پھوس کا انتظام کرتا۔ چاچا کی روٹی کا اہتمام کرتا۔ اور نجانے کتنے کام جو میرے بس کے نہیں تھے اپنے سر لے لیتا۔ دو دن کی انتھک محنت کے بعد چاچا نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور قسم کھا کر کہا کہ تو دو دن میں ایک مہینہ کا کام کر چکا ہے اس لیے اب خود پر نہیں تو مجھ پر رحم کھا اور جو لوٹنے آیا تھا لوٹ کر چلا جا۔

چاچا کی یہ بات سن کر مجھے بلا کا اطمینان ہوا کہ میری محنت پوری طرح وصول ہوئی ہے۔ دو دن کی طے شدہ دہاڑی کے علاوہ اضافی محنت پر جو اضافی پیسے بن رہے تھے اُن سے میں نے لال چوڑیاں خرید لیں۔ اور خوشی خوشی چچا کو گلے لگا کر بے انتہا جوش کے عالم میں وہاں سے چل دیا۔ راستے میں میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور رونگٹے ایک انوکھی چاہت کے تحت کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔

- -

یہ چوڑیاں جب میں نے اگلے دن اُسی کے انداز میں اُس کے سامنے لہرائی تو حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور بڑی ہو گئیں۔ ''یہ کیا ہے؟'' اُس کی معصومانہ حیرت دیکھنے لائق تھی۔ اسے ہماری اور آپ کی زبان میں چوڑیاں کہتے ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر کس کی ہیں؟ اُس کی حیرت میں معصومیت کا رنگ مزید نکھر گیا تھا۔

آپ کے لیے ہیں آپ کو پسند ہیں نا؟

اور پھر جب میں نے اُسے بتایا کہ میں نے یہ چوڑیاں کیسے حاصل کی ہیں تو اس کی اُس وقت کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔

بہت دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی : ''تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے چھو کر دیکھنے کی خواہش کی تھی ؟'' میں سناٹے میں آ گیا اور بدھو عاشقوں کی طرح اُسے تکتے ہوئے یاد کرنے لگا کہ وہ کون سا دن تھا جب گونگے کو زبان عطا ہوئی تھی ۔ لیکن وہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی نہ میرا جواب سننے کی منتظر تھی ۔ سو مجھے بھینچ کر گلے لگا لیا ۔

اُس کے حصار میں آنے کے بعد لمحے کا نجانے وہ کون سا حصہ ہوگا جب میں ہوش و حواس سے یک لخت بے گانہ ہو چکا تھا ۔ مدہوشی اور بے خودی کی ایک ایسی کیفیت مجھ پر طاری تھی جس کے آگے ہر خوش گوار احساس تیاگنا کوئی مشکل نہ تھا ۔ بن پیے ایسا مست ہو جانا کہ سارا جہاں رقص کرتا ہوا نظر آئے ، شاعر کے اس تخیل کا مطلب آج سمجھ آیا تھا ۔

چند لمحوں بعد جب میرے حواسِ خمسہ کچھ بحال ہوئے تو اپنی بے وقوفی پر شدید غصہ آیا ۔ اگلے ہی لمحے میں نے اپنی قوت لامسہ کا استعمال کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اُس کی کمر کے گرد پوری قوت سے کس دیے ۔ ایک ہلکی سی ہچکی اُس کے منہ سے نکلی ۔ اُس کے بعد یاد نہیں کہ ہم دونوں اسی حالت میں ایک دوسرے میں کتنی دیر تک مدغم رہے ۔

بمشکل جب ہم بہت دیر بعد ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو لب ساکت تھے مگر آنکھیں گویا تھیں ۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم ایک دوسرے سے اجازت طلب کر رہے تھے ۔ وہ یک دم سنگھار میز پر رکھی اپنی نئی چوریوں میں منہمک ہو گئی اور میں نے باہر نکلنے کے لیے کمرے کے دروازے کی راہ لی ۔ پلٹتے ہوئے میں اُس کے امرد رس جیسے لبوں کی دلکش مسکان کو دیکھ چکا تھا اور جواباً میرے ہونٹوں پر بھی دبی دبی سی ایک معنی خیز مسکراہٹ نمایاں تھی ۔

- -

کچھ دیر پہلے ہونے والے واقعے میں کھویا ہوا ابھی میں صدر دروازہ عبور کرنے ہی والا تھا کہ میرے دائیں کندھے پر کسی کا وزنی ہاتھ آ کر جم گیا ۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ وہی جوان تھا جس کو میں نے پہلی ہی نظر میں ناپسندیدہ قرار دے دیا تھا ۔ یقیناً یہی ناپسندیدگی سامنے والے کی طرف سے بھی ہوگی ۔ کچھ پل ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے خاموشی میں بیت گئے ۔ پھر بات اُسی نے دوستانہ انداز میں شروع کی ۔

اتنے دن سے آ رہے ہو لیکن کبھی تم سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ آؤ کچھ دیر ساتھ بیٹھتے ہیں۔ وہ میرے کندھے پر بے تکلفانہ ہاتھ دھر کر چلنا شروع ہو گیا اور چلتے چلتے مجھے لان میں لے آیا، جہاں ایک چبوترے پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ اب باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد وہ آہستہ آہستہ ''مدعا'' پر آ رہا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے ایک مرتبہ جِم میں ایک آدمی مجھ سے پنگا لے رہا تھا میں نے لکڑی کا کیش کاؤنٹر ہوا میں کئی فٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے پورا جم مجھ سے دہلتا ہے۔''

شکر ہے اُس نے لوہے کا ٹیبل نہیں اٹھایا تھا ورنہ مجھے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ خیر اب پھینکنے کی باری میری تھی تو میں نے اس سے بھی بڑی ہانک لگائی۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنی لڑائی میں میں نے ایک گاڑی کو لات ماری تھی اور وہ ہوا میں اڑتے ہوئے ایک ساتھ چار لڑکوں پر گری تھی۔ تب سے وہ گاڑی اسٹارٹ ہونا ہی بھول گئی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''میں نے اتنے سنجیدہ انداز میں اس کی بے پر کی کا جواب دیا تھا کہ وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا اور میرے دعوے پر یقین کرنے کے لیے مجھ سے مزید دلائل مانگنے لگا۔ جب وہ ہو سکتا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ''میں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں جواب دیا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جس موقع کی تلاش میں وہ کئی دن سے مارا مارا پھر رہا تھا آج وہ موقع میں نے اُسے بڑی آسانی سے مہیا کر دیا تھا۔''

''بہت زبان چلتی ہے تمہاری۔''

''صرف زبان ہی نہیں ہاتھ اور پاؤں بھی خوب چلتے ہیں۔'' میرے دوبدو جلے کٹے جواب پر اُس نے تمسخرانہ لہجے میں کھینچ کر ''اچھا'' کہا اور پوری طاقت کے ساتھ اپنے سیدھے ہاتھ سے میرے بازو پر دھکا مارا۔ میں بینچ سے دفعتاً نیچے جا گرا لیکن جان بوجھ کر لڑکھڑاتا ہوا تھوڑا آگے نکل گیا۔ تاکہ اگلے وار کے لیے خود کو تیار کر سکوں۔ طبلِ جنگ بج چکا تھا۔ اور میری منشا کے مطابق پہل بھی میرے حریف نے کی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے استاد کی لاج رکھی۔ اکیڈمی میں داخلہ کے بعد مجھے پہلا سبق یہی سکھایا گیا تھا کہ جب تک کوئی آپ پر ہاتھ نہ اٹھائے تب تک اپنے ہاتھ قابو میں رکھنے چاہیے۔

خیر! ابھی میں خود کو سنبھالتا ہوا اٹھا ہی تھا کہ میری توقعات کے برخلاف ایک مناسب حجامت کا پتھر میری طرف آیا اور میرے ہونٹوں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ شکر یہ ہوا کہ نشانہ چوک گیا۔ اگر منہ کے بیچوں بیچ پتھر پڑتا تو۔۔۔۔۔۔ آگے کا سوچ کر ہی مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ یہ دوسرا وار مجھ پر بڑا کاری گزرا۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور خون رس رہا تھا۔ ابھی میں اپنی ہتھیلی پر ٹپکتا خون دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو رہا تھا کہ اس نے آناً فاناً میری گردن کو اپنی بغل میں دبوچ لیا۔ میں سخت تکلیف میں آ گیا۔ ایک تو ہونٹوں کا خون پھر گردن پر اس بھینسے کا بڑھتا ہوا دباؤ۔ پے در پے اچانک حملوں نے مجھے بالکل بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں اللہ نے مہربانی کی اور ایک جاندار ترکیب مجھے سوجھ گئی۔ میرا منہ اس کی رانوں کے اوپری حصے کے بالکل قریب تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ اپنے دانت اس کی سرین میں گھوپ دیے اور اتنی زور سے کاٹا کہ وہ چیخ مارتا ہوا اچھل کر پرے ہٹا۔ اس کی گرفت جیسے ہی مجھ پر سے ڈھیلی ہوئی میں جھٹکے سے باہر نکل آیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر مختلف انداز میں پے در پے تین مکے اس کے سینے پر برسا دیے۔

باکسنگ کی اصطلاح میں اسے Punching Combination کہتے ہیں۔ ہر نوآموز مکے باز کو یہ اور اس طرح کے دیگر مجموعے اوائل تربیت میں ہی سکھا دیے جاتے ہیں۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے دو مکے اپنی جگہ سے ملے بغیر بائیں ہاتھ سے مارے جاتے ہیں۔ جبکہ تیسرا مکا دائیں ہاتھ سے پیچھے کی ٹانگ کو خم دیتے ہوئے مدمقابل پر برسایا جاتا ہے۔ میں نے اس کامبینیشن کی بہت مشق کی تھی۔ حسن اتفاق سے گزشتہ رات ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس میں مہارت ہو چلی ہے۔ آخری دو منٹ میں جب میں مسلسل صحیح باکسنگ کر رہا تھا تب میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ راؤنڈ ختم ہونے کے بعد جوش کے عالم میں میں نے اتنی زور سے دیوار پر لات ماری تھی کہ دیوار کا رنگ جہاں جہاں سے اکھڑا ہوا تھا سب کا سب اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

بہرحال میرے مکوں سے وہ بری طرح بلبلا اٹھا تھا اور جان چکا تھا کہ اُس کا شکار اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے قدرے فاصلے سے کھڑے ایک دوسرے کی پہل کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ڈھیٹ بنا اپنی جگہ جما رہا تو وہی دھاڑتا ہوا میری طرف لپکا۔ لیکن میں اس کی چیخوں سے بھلا کہا ڈرنے والا تھا۔ میرے آگے نہ بڑھنے کی بھی ایک وجہ تھی۔ میں سوچ چکا تھا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس لیے وہ جیسے ہی میرے قریب آیا میں نے بلا کی تیزی سے اس کی گردن کو اپنے داہنے بازو میں جکڑ لیا۔ اس داؤ کو ریسلنگ کی اصطلاح میں Neck Lock کہتے

ہیں۔ یہ میرا بہت ہی پسندیدہ اور موثر داؤ تھا۔ اسکول کے دنوں کے بڑے بڑے پھڈوں میں میں نے نامی گرامی پھنے خانوں پر یہ پیچ آزمایا تھا اور کبھی بھی مجھے اس میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار گردن آپ کے بازوؤں کی گرفت میں آگئی تو سامنے والے کے ہاتھوں کی پھرتی ریت کا ٹیلہ ثابت ہوتی ہے۔ وہ صحیح طرح اپنے ہاتھوں کا استعمال کر کے نہ خود کو چھڑا سکتا ہے نہ آپ پر جوابی حملہ کر سکتا ہے۔ بس محبوس پرندہ کی طرح پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ اُس کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ وہ مجھے مغلظات بکتے بکتے ''چھوڑ چھوڑ'' کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔ لیکن وہ جتنا شور کرتا تھا میں اپنا دباؤ اتنا ہی بڑھا دیتا تھا۔

آخر کار رہائی کی راہ نکل ہی آئی، جس سے میں مطلقاً غافل تھا۔ اس نے غیر محسوس طور پر گھسٹتے گھسٹتے قریب رکھے گملے سے مٹھی بھر مٹی لی اور میری آنکھوں پر دے ماری۔ میں ایک دم سے پیچھے ہٹا اور بے اختیار میرے ہاتھ میری آنکھوں پر گئے لیکن مجھے معلوم تھا اگر اس وقت میں انہیں مسلوں گا تو یہ میرے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث ہو گا۔ یہاں میں خود کو جتنی شاباشی دوں کم ہے کہ اس تکلیف دہ صورت حال میں بھی میں نے اپنی چھٹی حس کو بیدار رکھا۔ میں فوری طور پر دیکھنے کے قابل نہیں تھا لیکن محسوس کر چکا تھا کہ وہ تقریباً میرے سر پر آ چکا ہے۔ اندھوں کی طرح زمین پر پیٹھ کے بل گرتے ہوئے میں نے اپنی ٹانگ اُس کی ٹانگوں میں پھنسا دی جس کی وجہ سے وہ بھی گر پڑا۔ بجلی کی تیزی سے اٹھ کر میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر پورے باغ میں اُس کو گھسیٹنا شروع کر دیا۔

بالآخر اسی پتھر نے اس کی مدد کی جس سے اس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ وہ پتھر واقعی اس کا وفادار تھا۔ میری ایڑی اس سے ٹکرا گئی اور ایک بار پھر میں عرش سے فرش پر آ گیا۔ تاہم ہر بار کی طرح اس مرتبہ بھی گرنے کے بعد اٹھنے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مدمقابل کو بھی کھڑا ہونے کے لیے اتنی مہلت بہت تھی۔

اب ہم ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے بالکل قریب ایک دوسرے میں گتھم گتھا تھے۔ کبھی گلا دبانے کی کوشش کرتے تو کبھی بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو بس میں کرنے کے لیے جتن کرتے۔ کبھی مکے تو کبھی لاتیں تو کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ ابھی یہ سڑک چھاپ لڑائی چل ہی رہی تھی کہ گھر کے سربراہ کی چیخ سنائی دی۔ انہوں نے فوراً ہمیں ایک دوسرے سے کھینچ کر الگ کیا۔ میں ان کا احترام کرتے ہوئے فوراً اس سے الگ ہو گیا۔ لیکن اس نے چھوڑتے چھوڑتے بھی ایک چانٹا میرے گال پر دے مارا۔ اس کا بدلہ میرے بجائے خود والد بزرگوار نے لیا اور اس سے کئی گنا تیز تھپڑ اپنے بیٹے کو جڑ دیا۔

کچھ ہی فاصلے پر والدہ محترمہ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کے عالم میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھیں اور انہی کے کندھے سے لگی وہ ڈری سہمی ماہ لقامدھوشالا جیسی آنکھوں میں دو موتی سجائے مجھے ابتدائی طبی امداد فراہم کر رہی تھی ۔ والد صاحب بری طرح گرجتے برستے بازو سے کھینچتے ہوئے اپنے بیٹے کو اندر لے جا رہے تھے ۔ اُن کا مشفقانہ لہجہ اُس وقت کہیں کھو کر رہ گیا تھا اور تصویر کا دوسرا رخ مجھے حیران ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرا بھی رہا تھا ۔ بیٹے کے پیچھے پیچھے تیز قدموں کے ساتھ والدہ صاحبہ بھی اندر جا رہی تھیں ۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ دونوں میں سے کسی کا دھیان میری طرف نہیں گیا تھا ۔ لیکن مجھے اس کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں تھا ۔ کیوں کہ میں جس کا ساتھ چاہتا تھا وہ میرے ساتھ ہی تھا ۔

- -

کچھ پل ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے بعد ہم ایک رومان انگیز خاموشی کے ساتھ بینچ پر آ بیٹھے تھے ۔ میرے ہمدم کی آنکھوں سے مسلسل بہتے آنسو دھوپ کے بنا بھی شبنم کی طرح چمک رہے تھے ۔ بہت دیر تک ایک دوسرے میں مست جب میرے جلتے ہونٹوں پر اس نے دھیرے دھیرے اپنی نرم و ملائم انگلیاں پھیرنا شروع کیں تو ایسا لگا بارش کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں میرے تپتے وجود کو شاداں و فرحاں کر رہی ہوں ۔ لیکن میں اُس وقت بے نیازی کی ایک ایسی حالت میں تھا جس میں مجھے اُس کا احسان بہت برا لگ رہا تھا ۔ اس لیے میں نے فوراً بدلہ چکانا مناسب سمجھا اور اُس کا کتابی چہرہ اپنے ہاتھوں میں سمو کر نینوں کے راستے جاری آب حیات کو لبوں سے سینچتا ہوا اپنے اندر جذب کرنے لگا ۔

* * *

فریاد کی لے ۔ ۔ ۔ محمد احمدؔ

وہ اِس وقت ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل مستعد تھا۔ بس انتظار تھا کہ مولوی صاحب سلام پھیریں اور وہ نماز ختم کر کے اپنا کام شروع کر دے۔ اُس نے اپنے ذہن میں اُن لفظوں کو بھی ترتیب دے لیا تھا جو اُس نے حاضرینِ مسجد سے مخاطب ہو کر کہنا تھے۔ جیسے ہی مولوی صاحب نے سلام پھیرا اُس نے بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہی سلام پھیرا اور ایک جھٹکے سے اُٹھا لیکن عین اُس وقت کہ جب اُس کو کھڑا ہو کر اپنی فریاد لوگوں تک پہچانی تھی اُس کی قمیص کا دامن اُسی کے پاؤں تلے آ گیا اور ایک دم سے اُٹھنے کی کوشش کے باعث دامن چاک سے لے کر کافی اُوپر تک پھٹ گیا۔ ابھی وہ قمیص کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ ہال کے دوسرے کنارے سے ایک آواز سُنائی دی۔

''میرے بھائیو! میں اور میرے گھر والے تین روز سے۔ ۔ ۔ '' رُندھی ہوئی آواز میں شروع ہوا یہ جملہ بیچ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔ اِس وقت کسی غیر متوقع ''حریف'' سے ٹکراؤ کا اُسے خیال تک نہیں تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ہال کے دوسرے دروازے کے پاس ایک خستہ حال لڑکے نے حاضرین کو متوجہ کیا لیکن وہ جملہ مکمل کیے بغیر ہی رونے لگا ابھی وہ اس نئے سائل کی ڈرامے بازی کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اچانک فریاد کرنے والا لڑکا جو اپنا جملہ مکمل کرنے کے بجائے رونے لگا تھا لوگوں کو پھلانگتے ہوئے بھاگنا شروع ہو گیا۔

نہ جانے اُسے کیا ہوا کہ اُس نے بھی نئے سائل کے پیچھے دوڑ لگا دی، کہ جیسے عین ''دھندے'' کے وقت پہنچ کر اُس کے حریف نے اُسے دعوتِ پیکار دے دی ہو اور پھر میدانِ جنگ سے فرنٹ ہو گیا ہو۔ اور جیسے اب اُس کی پہلی ذمہ داری ہی یہ ہو کہ پسپا ہوتے دشمن کو قریب ہی کہیں چھاپ لے اور پھر ایک ایک کر کے سارے بدلے چُکائے۔

صورتِ حال اب یہ تھی کہ آگے آگے خستہ حال نوجوان لڑکا روتا جاتا اور دوڑتا جاتا تھا اور وہ اُس کے پیچھے پیچھے ایک غیر ارادی تعاقب میں دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے اُس نے سوچا بھی کہ جب نیا لڑکا دوڑ ہی گیا تھا تو اُسے اپنا کام

شروع کرنا چاہیے تھا بجائے اِس کے کہ وہ اُس کے پیچھے اپنا وقت برباد کرنے آ گیا۔ لیکن یہ سوچ بھی اُس کے قدم روکنے کا حیلہ نہ بن سکی اور وہ اندھا دھند دوڑتا رہا۔

مختلف چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزر کر مفرور سائل ایک گھر کے دروازے میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے اُسے جا ہی لیا۔ اُس کی گرفت میں آ کر مفرور لڑکا شدید پریشانی کا شکار نظر آتا تھا اور اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ اُس کا اندھا دھند تعاقب کرنے والا یہ شخص کون تھا اور آخر اُس سے ایسا کیا قصور ہوا تھا کہ اُسے نجات ملنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا تھا۔

''کون ہے بے تو؟؟؟؟''اُس نے حقارت سے لڑکے سے پوچھا

''میں! میں!''لڑکے کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ اس اچانک آ پڑنے والی اُفتاد سے کیسے نمٹا جائے۔

پھر شاید اُسے ہی خیال آیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہی جارح ہو رہا ہے تو اُس نے اپنے لہجے کو کچھ بہتر بناتے ہوئے پوچھا ''مسجد میں کیا کرنے آیا تھا؟''

''وہ، میں۔۔۔ مجھے پیسے چاہیے تھے''لڑکے نے ہکلاتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

''ہمارے پاس کچھ نہیں ہے کھانے کو، پیسے بھی نہیں ہیں''وہ سسکتا جاتا اور بتاتا جاتا۔

''میں نے۔۔۔۔ میری امی نے، میرے بھائی نے۔۔۔ ہم نے کچھ نہیں کھایا''رو رو کر لڑکے کا بُرا حال تھا اور اُس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سوال جواب کیوں کر رہا ہے۔

''تین دن سے ہمیں پانی کے علاوہ کچھ نہیں ملا، میں نے سوچا مسجد میں جا کر۔۔۔ جیسے دوسرے لوگ۔۔۔''لڑکا پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

اُس کے ہونٹوں سے سارے سوال غائب ہو گئے تھے اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

پھر اچانک اُس نے آگے بڑھ کر لڑکے کو گلے سے لگا لیا، اور پھر وہ دونوں رونے لگے۔ جیسے جیسے اُن کا کوئی مر گیا ہو۔ لیکن اُن کا اس دنیا میں تھا ہی کون جو مرتا۔ اور اُن کا کوئی ہوتا تو کیا وہ اس طرح روتے؟

وہ روتے جاتے اور ایک دوسرے کو بھینچتے جاتے کہ جیسے کوئی سالوں برسوں بعد ملا ہو اور اس بات کا یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ ملن کا لمحہ واقعی آن پہنچا ہے۔

آس پاس جمع ہوتے بچوں کو دیکھ کر اُسے کچھ ہوش آیا۔ اُس نے لڑکے کو خود سے جدا کیا اور ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پوچھتے ہوئے بولا۔ ''میرے ساتھ آ'' اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔

سائل لڑکا میکانیکی انداز میں اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ راستے میں وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ کہتے بھی تو کیا۔

اُن کا یہ مختصر سفر ایک چھوٹے سے ہوٹل پر ختم ہوا اور اُس نے لڑکے کو ہوٹل پر ایک تخت پر لا کر بٹھا دیا۔ ادھر اُدھر دیکھنے پر اُسے ایک پانی کا ڈرم نظر آیا۔ اُس نے ڈرم سے پانی جگ میں نکالا اور منہ دھونے لگا۔ منہ ہاتھ دھو کر اُس نے ایک جگ اور بھرا اور لڑکے کو بُلا کر اُس کا منہ بھی دھلوا دیا۔

کچھ تازہ دم ہو کر وہ پھر سے تخت پر بیٹھے تو بیرا اُن کے سر پر نازل ہو چکا تھا۔ ''ہاں اُستاد! کیا لاؤں؟''

''ایک دال فرائی لے آ اور روٹی گرم لانا۔'' اُس نے بیرے کو دیکھا اور سوچتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر میں بیرا کھانا لے آیا۔ کھجور کے پتوں سے بنی رکابی میں تندور کی تازہ روٹیاں اور اسٹیل کی پلیٹ میں چنے کی دال، فرائی کی ہوئی۔ سائل لڑکے کے آنسو اب تک تھم گئے تھے لیکن اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے لڑکے کی طرف دیکھا اور کھانے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''گرو، ہو جا شروع۔۔۔!''

لڑکے نے جھجکتے ہوئے ایک نوالہ بنایا اور دال کی پلیٹ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ نوالے کے منہ میں جاتے ہی اُس کی ساری جھجک رُخصت ہو گئی اور وہ بے صبری سے کھانا کھانے لگا۔ اُسے کوئی خاص بھوک نہیں تھی لیکن لڑکے کا ساتھ دینے کے لئے وہ بھی چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا رہا۔

کھانا ختم ہونے پر اُس نے بیرے کو آواز دے کر چائے منگوائی اور مسجد سے فرار اختیار کرنے والے سائل کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم مسجد سے بھاگ کیوں گئے تھے۔'' وہ اب تو سے تم پر آ گیا۔

لڑکے نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر کہا ''مجھے شرم آ گئی تھی۔ میں نے، میرے خاندان والوں نے کسی نے بھی کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ اگر حالات اس قدر خراب نہ ہوتے تو شاید میں مسجد میں اس غرض سے آنے کی ہمت بھی نہ کر پاتا۔''

''شرم!'' اُس نے حیرت اور غصے سے لڑکے کی طرف دیکھا۔

''تمھیں کیوں شرم آئی!'' اُس کی آواز غیض سے بھّرا رہی تھی۔

''شرم تو تمھارے پڑوسیوں کو آنی چاہیے، تمھارے رشتہ داروں کو آنی چاہیے کہ تمھارے ہاں تین روز سے کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور وہ بے خبر ہیں۔''

''تمھاری پڑوسی اپنی زندگی جی رہے ہیں، کھا رہے پی رہے ہیں عیش کر رہے ہیں۔ کیا اُن کا فرض نہیں کہ اڑوس پڑوس کا بھی حال پوچھیں۔ کس پر کیا گزر رہی ہے۔ کس پر کیا مصیبت آن پڑی ہے'' ذرا توقف کے بعد وہ پھر شروع ہوا۔

''شرم تو تمھارے رشتہ داروں کو آنی چاہیے۔ کوئی تمھیں پوچھنے نہیں آیا'' اُس نے زور سے سر کو جھٹکا دیا۔

''کیسی رشتہ داری ہے آج کل کی۔ وقت اچھا ہو تو صبح شام چکر لگائیں اور جہاں بُرے دنوں نے رستہ دیکھا وہیں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جائیں گے۔

''لعنت ہے ایسی رشتہ داری پر اور لعنت ہے ایسے پڑوسیوں پر۔''اُس نے زور سے چائے کا کپ تخت پر پٹخا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس نے ہوٹل کے مالک سے کہہ کر کچھ کھانا لڑکے کے گھر والوں کے لیئے بھی پیک کروایا اور بل ادا کرنے کے بعد کچھ پیسے لڑکے کی جیب میں بھی ٹھونس دیے۔

''میں اسی ہوٹل پر بیٹھتا ہوں شام کے بعد، کبھی بھی کوئی مسئلہ ہو تو میرے پاس آ جانا۔ اور ویسے بھی ملتے رہنا'' اُس نے لڑکے کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ویسے بھی چھڑا چھانٹ ہوں، میرا گزارا جیسے تیسے چل ہی جاتا ہے۔'' اب اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ نے جگہ بنا لی تھی۔

*****

عصر کی نماز اُس نے ایک اور مسجد میں پڑھی۔ یہ مسجد بازار کے بیچ و بیچ تھی اور اس میں نمازیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ نماز ختم ہوئی تو اُس نے اپنی دردناک آواز میں فریاد شروع کر دی۔ آج اُس کی آواز میں الگ ہی کرب تھا۔ اُس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے اور اُس کے رٹے رٹے جملے آج تاثیر میں گُندھے ہوئے تھے۔

اُس کے پیروں میں بچھے رومال پر چھوٹے بڑے نوٹ جمع ہو رہے تھے ۔ وہ مستقل رو رہا تھا اور اندر سے ایک اطمینان اُس کے اندر اُتر رہا تھا کہ رومال پر جمع ہونے والے نوٹ اب اُس کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ اہم تھے ۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو خوشی سے چمک رہے تھے اور اُس کا پھٹا ہوا دامن ہوا میں لہرا لہرا کر مسرت کا اظہار کر رہا تھا ۔

* * *

اردو محفل کا شاعر

اس شمارے کے شاعر محمد حفیظ الرحمان کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت کم گو ہیں لیکن جو کچھ بھی کہا خوب صورت کہا۔ ان کی مندرجہ ذیل غزلیں وقتاً فوقتاً اردو محفل پر پیش کی جا چکی ہیں۔

غزلیں ۔۔۔ محمد حفیظ الرحمان

جاں لے کے چلے ہیں کہ کہیں وار ہی دیں گے
ورنہ تو یہ حالات ہمیں مار ہی دیں گے

آنکھوں کو طراوٹ بھی ملے گی تو انہی سے
سایہ بھی ہمیں یہ گھنے اشجار ہی دیں گے

کیوں نعرہ انا الحق کا لگاتے ہو دِوانو؟
دیوانے جواب اِس کا سرِ دار ہی دیں گے

لٹکاؤ صلیبوں پہ کہ تم دار پہ کھینچو
ہم اہلِ محبت ہیں، تمھیں پیار ہی دیں گے

دیکھا تھا ہزاروں نے مرے قتل کا منظر
پر اس کی گواہی مرے کچھ یار ہی دیں گے

ہر چند زبوں حال ہیں پر قوم کی خاطر
قربانی بھی ہم جیسے گنہگار ہی دیں گے
آئے گا بلاوہ بھی مدینے کا انہی سے
اور اذنِ سفر بھی مرے سرکار ہی دیں گے
**

جنگل میں بس ایک ہی رستہ جس پر بیٹھا کالا ناگ
پاؤں تو ہو گئےَ من من بھر کے، چھیڑو بین پہ کوئی راگ
جن کو ملی ہیں دل کی مرادیں، اُن کی قسمت اُن کا نصیب
میں نے اگر کچھ بھی نہ پایا، میری قسمت میرے بھاگ
کوئی ہے ناخوش محل میں رہ کے، گھی کے نوالے کھا کر بھی
میں تو خوش ہوں گرچہ ملی ہے سوکھی روٹی، باسی ساگ
چہرے پر نہ جاؤ کسی کے، کلجگ ہے، ہشیار رہو
جن کو سمجھیں سیدھے سادھے، نکلیں وہ اتنے ہی گھاگ
چین نہیں ہے مجھ کو کسی کل، جاگ سکوں نہ سو ہی سکوں
کاش کوئی سمجھائے مجھ کو، تن میں بھری ہے کیسی آگ
دور رہے ساحل سے جتنی، اُتنی ہی منہ زور رہے
موج جو ساحل پر آ جائے، کچھ بھی نہیں پھر، جھاگ ہی جھاگ

وقت کے سرپٹ گھوڑے پر ہم بیٹھے کتنے بے بس ہیں
نہ ہی گھوڑا اپنے بس میں، نہ ہی ہاتھ میں اُس کی باگ
صبح کے ہیں آثار ہویدا، ڈوب چلے ہیں تارے بھی
کھوٹی ہو جائے نہ منزل، ''جاگ مسافر اب تو جاگ''

**

ہے کون دھنک کے رنگوں میں لپٹا ہوا محوِ خرام میاں
گر دیکھ لے ہم کو ایک نظر بِک جائیں گے بے دام میاں
وہ وعدہ کر کے بھول گیا تم کب تک رستہ دیکھو گے
اب دِن تو سارا بِیت چکا اور ہونے آئی شام میاں
اب جاہ و حشم کی حسرت کیا اب نام و نمود کی خواہش کیا
جب ساری عمر گزاری ہے پھرتے پھرتے گمنام میاں
یوں رات کے سناٹے میں اگر جاگ اٹھا دل کا درد تو کیا
تم نامِ خدا کا ورد کرو آ جائے گا آرام میاں
یہ ہجر کی رات یہ سناٹا، یہ بھیگی بھیگی چشمِ فلک
تارے بھی ہیں سارے مہر بہ لب اور گم سم ماہِ تمام میاں
دونوں میں کوئی فرق نہیں، وہ قیس ہو یا فرہاد ہی ہو
دونوں کی ایک ہی قسمت تھی، اور ایک ہوا انجام میاں

وہ نقشِ محبت مٹ بھی چکا، وہ شکل بھی دل سے محو ہوئی

اب اس کو ہم سے کیا مطلب، کیا اس سے ہم کو کام میاں

تم بھولے ہو تم ناداں ہو، تم دل کو کہاں پر کھو آئے

اتنا تو سوچ لیا ہوتا ہو جاؤ گے بدنام میاں

**

صبح کے دھوکے میں پھر شام اٹھا کر لے آئے

چاہا آغاز تھا، انجام اٹھا کر لے آئے

جب پڑا وقت تو سب چھوڑ دیا مال و منال

نقدِ دل اور کچھ الزام اٹھا کر لے آئے

تیرگی جب بھی کبھی مدِ مقابل آئی

اک دیا ہم بھی سرِ شام اٹھا کر لے آئے

جام تک اپنی رسائی جو کبھی ہو نہ سکی

بزم سے دردِ تہِ جام اٹھا کر لے آئے

رات بھر جاگ کے بس آنکھ لگی تھی میری

کیوں مجھے صبح کے ہنگام اٹھا کر لے آئے

دیدنی تھا افقِ دل پہ ستاروں کا ہجوم

ہم وہ منظر بھی لبِ بام اٹھا کر لے آئے

لطف آ جائے جو ماضی کے خزینے سے حفیظ
کوئی چپکے سے وہ اک شام اٹھا کر لے آئے
**

دو قدم ساتھ چل کے لوٹ گئے
لوگ رستہ بدل کے لوٹ گئے
ہم سمجھتے تھے ساتھ ساتھ ہیں وہ
پھر سنا یہ کہ کل کے لوٹ گئے
وہ جو خوگر تھے گرم موسم کے
ٹھنڈی چھاؤں میں جل کے لوٹ گئے
آپ مشکل میں میرے پاس آئے
چار دن میں سنبھل کے لوٹ گئے
جانے کیوں اتنے پیش و پس میں تھے آپ
گھر سے باہر نکل کے لوٹ گئے
وہ جو آئے تھے اپنا عکس لئے
تیرے پرتو میں ڈھل کے لوٹ گئے
ڈھونڈنے آئے تھے تجھے ہم بھی
کفِ افسوس مل کے لوٹ گئے

لوگ آئے تھے آپ سے ملنے
مجھ کو دیکھا تو جل کے لوٹ گئے

* * *